تراشتا ہے سفر

فاخرہ جبین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فاخرہ جبین

بلیک جینز وائٹ کلر کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور اس پر بلیک کارڈیگن پہن کر میں نے اسکارف گلے میں ڈالا تھا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے جونہی میری نظر موبائل پر باتیں کرتی مما اور ان کے ساتھ شام کے اخبار میں منہمک احتشام احمد پر پڑی تو میرا موڈ بری طرح بگڑ گیا تھا۔

"کیا ضروری تھا کہ یہ دونوں اس وقت یہاں موجود ہوتے؟" میں نے تلخی سے سوچا تھا اور پھر ان دونوں کو مکمل نظرانداز کر کے میں نے بیرونی دروازے کا رخ کیا تھا۔

"شانزے بیٹا کہاں جا رہی ہو اس وقت؟" وہی شہد کی مانند میٹھا نرم لہجہ تھا مگر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگی تھیں۔ میں سنی ان سنی کرتے ہوئے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

"شانزے میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔" احتشام احمد کی قدرے بلند آواز نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔

"مگر میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے پلٹ کر زہرخند لہجے میں کہا تو ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی مگر وہ ضبط کے ہنر سے بخوبی واقف تھے اسی لیے اگلے ہی لمحے وہ بالکل نارمل ہو گئے تھے۔ البتہ مما کے چہرے پہ ناگواری کے شدید

تاثرات ابھر آئے تھے۔

"واٹ نان سینس شان یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟" انہوں نے موبائل آف کر کے سائیڈ ٹیبل پہ پٹخا۔

"احتشام احمد تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔" ان کا تنبیہی انداز میں کہا گیا جملہ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

"مما پلیز۔" میں ایک دم چیخ اٹھی تھی۔

"میں ہزار بار آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہ شخص آپ کے ہزبینڈ کے خانے میں تو فٹ ہو سکتا ہے مگر میرے باپ کی جگہ کبھی نہیں لے سکتا۔" ان کا کہا گیا ایک جملہ ہی جیسے مجھے بھٹی میں جھونک گیا تھا۔ اپنی

[illegible] کر میں رکی نہیں تھی بلکہ اپنے پیچھے پوری [illegible] سے دروازہ بند کرتے ہوئے میں باہر نکل آئی تھی اور معلوم نہیں ایسے کسی بھی موقع پر اتنا زور توڑ آنسوؤں ڈھیر غصہ میرے دل میں کہاں سے امڈ کر آتا تھا۔ اس وقت بھی میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں لان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں کی پتیاں نوچ ڈالوں یا قطار در قطار رکھے گئے گملوں کو اپنی ٹھوکروں سے تہس نہس کر دوں۔

اسی دیوانگی کی حالت میں جب میں گاڑی لے کر نکلی تو مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور جب ایک طویل، سنسان سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے میں تھک گئی تو بے اختیار ہی میرا پاؤں بریک پر جا پڑا۔

"اوہ میرے خدا۔" میں نے تھک کر دونوں ہاتھ اپنی گود میں گرا لیے اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بہت بڑے محاذ پر لڑتے لڑتے میں نڈھال ہو کر رہ گئی ہوں۔

"ہاں۔ شاید یہ جنگ ہی تو ہے جس میں تنہا لڑتے لڑتے میں خود سے بھی جدا ہوتی جا رہی ہوں اور کیا یہ ضروری ہے کہ میں اس موقعے پر کمپرومائز کر کے مما کو مکمل طور پر "قابض" قرار دے دوں؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔" پاپا کا ہارا ہوا وجود میری نظروں کے سامنے آیا۔

"کاش، کاش پاپا آپ میرے سامنے ہوتے تو میں ایک بار آپ سے ضرور یہ پوچھتی کہ آپ نے اتنی جلدی زندگی کیسے ہار دی؟ تھوڑی جدوجہد تو کرتے پھر دیکھتے آپ کی شانزے آپ کے لیے کیا کرتی مگر آپ نے تو اپنی انا میں سوراخ ہوتے دیکھ کر [illegible] پاپا۔ آپ کی شانزے اپنے دونوں ہاتھ آپ کی طرف بڑھائے آپ کو سہارا دینے کے لیے کھڑی تھی۔ مگر پاپا آپ نے دیکھا ہی نہیں۔" میرے وجود میں سارا غم و غصہ، ساری تپش گرم سیال کی صورت میری آنکھوں سے بہہ نکلی تھی۔

"اور مجھے لگا جیسے پاپا جانی میں آج بھی [illegible] دینے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے [illegible] کھڑی ہوں۔"

ٹھک ٹھک۔ "مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی شیشہ بجا رہا ہے۔ بمشکل میں نے اپنی جلتی [illegible] کھول کر دیکھا وہ جو کوئی بھی تھا میرے آنکھیں [illegible] ہی ایک دم سیدھا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ میں اس کی [illegible] بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پائی تھی۔

"باہر آئیے۔" گاڑی کا دروازہ کھولے وہ [illegible] سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"کون ہے؟ کیا کرنے والا ہے؟" میں ششدر [illegible] بیٹھی رہ گئی۔

"محترمہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں باہر تشریف لے آئیے۔" خاصے مہذبانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ حیران پریشان سی کھلے دروازے سے باہر آ گئی۔

"آنسو پونچھ لیجیے۔" اس نے براؤن کلر کا [illegible] میری طرف بڑھایا تھا اور میں اس اچانک صورت حال پر اس طرح شرمندہ ہوئی تھی کہ بے ساختہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر اپنے ہاتھوں کی [illegible] سے آنسو صاف کرنے لگی تھی۔ اس نے کندھے [illegible] کر رومال دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"میں نے زندگی میں بڑی طویل جدوجہد کی ہے [illegible] اس جدوجہد میں سب سے بیکار چیز ان آنسوؤں کو [illegible] ہے۔" دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے وہ شخص بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"اگر کوئی دکھ آپ کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے [illegible] جیسے یہ آنسو دکھوں کی فصل پر بارش کا کام دیں گے اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو اتنا ڈھیر سارا رو لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ پر موجود ہے۔ تو جب یہ آنسو ہمارے کسی کام نہیں آ سکتے تو کیوں نہ ہم ان کی جگہ کچھ نیا سوچیں۔"

اس نے اپنی بات مکمل کر کے میرے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی اور یقیناً اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔ اسی لیے اس نے تاسف سے [illegible] کیا تھا۔

[illegible]" اس نے جیسے زبردستی اپنا کارڈ [illegible] میں تھمایا تھا۔

"[illegible] ملے تو یہاں ضرور آئیے گا۔ زندگی [illegible] مسکراتی ملے گی آپ کو۔"

[illegible] بھر پلٹ گیا تو میں نے اتنی دیر [illegible] پلکیں اٹھائیں۔ وہ بہت دراز قامت [illegible] میں اپنی کار کا دروازہ کھول کر وہ اس میں [illegible] سے گاڑی لے اڑا تھا۔ میں صرف اس [illegible] بال اور چوڑی پشت ہی دیکھ پائی تھی [illegible] میں نے ہاتھ میں پکڑا وزٹنگ کارڈ بغیر [illegible] بورڈ پر اچھال دیا۔

"[illegible] ہے مجھ پر کیا اب میں اسی قابل رہ گئی ہوں [illegible] آتا جاتا ہرا ایرا غیرا مجھے زندگی گزارنے [illegible] اصول پڑھانے لگے۔" خود پر بری طرح بڑبڑاتے [illegible] میں نے گاڑی واپسی کے لیے اسٹارٹ کی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
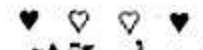
"میری سمجھ میں نہیں آتا شانزے آخر تمہارا [illegible] کیا ہے؟" دنیزہ سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ میں [illegible] چپ راستے میں آئی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو [illegible] دور دور تک پھینکتی رہی۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں یونیورسٹی سے غیر حاضر ہوئے۔ آج اگر مارے باندھے آ ہی گئی ہو تو تم نے [illegible] ڈھنگ سے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی اور ابھی [پرو]فیسر بشیر احمد ارشد کی کلاس میں تم نے جس طرح [illegible] بی ہیو کیا تھا اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک [منٹ] میں تمہاری انسلٹ کر کے کلاس سے باہر نکال [دیتا۔]"

میں نے اکتا کر اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

"کیوں اتنی گرمی کھا رہی ہو آخر ایسا کیا کر دیا میں نے؟"

"واٹ ابھی تم نے کچھ کیا ہی نہیں ان کے پورے لیکچر کے دوران تم اپنی پنسل اور نوٹ بک سے کھیلتی رہی ہو تین مرتبہ انہوں نے تمہیں پکارا تھا اور اگر میرے متوجہ کرنے پر تم حواسوں میں نہ آ گئی تھیں تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "سر میں نے آپ کا لیکچر سنا ہی نہیں۔" یعنی کہ حد ہو گئی۔" کیفے ٹیریا میں پہنچ کر اس نے فائل میز پر پٹخی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سینڈوچ اور چائے کا آرڈر دے کر میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ بالکل بھی میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ ایک پاؤں مسلسل ہلاتے ہوئے وہ خواہ مخواہ باہر دیکھے جا رہی تھی گویا مکمل ناراض تھی۔

"دنیزہ پلیز اپنا موڈ درست کر لو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تمہاری ناراضگی برداشت کر سکوں۔" میں نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور غالباً اس نے اس ایک نظر میں ہی میری کیفیت کو جانچ لیا تھا۔ اسی لیے ایک طویل اور گہرا سانس لے کر اس نے گویا اپنا سارا غصہ باہر نکالا اور پھر نرمی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"شان تم مجھ سے وہ سب کیوں نہیں کہہ دیتیں جو تم کہنا چاہتی ہو کیا تم مناسب سمجھتی ہو کہ عام روایتی سے انداز میں، میں تمہاری منتیں کر کے تمہیں اس بات پر آمادہ کروں کہ تم وہ سب مجھ سے شیئر کرو جو تمہارے دل میں ہے۔

کیا تمہیں نہیں معلوم شان کہ تمہاری بے چینی مجھے کس قدر اذیت دیتی ہے؟"

میں نے میز کی کھردری سطح سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تیر رہی تھی۔

"اور یہ دنیزہ عثمان جو میرے دکھ کو بتا جانے ہی خود کو اذیت دے رہی ہے۔ اگر یہ جان لے کہ میں اس وقت کس کرب میں مبتلا ہوں تو نجانے یہ کیا کر ڈالے۔ مگر میں اسے یہ کیسے بتاؤں کہ زندگی نے اپنا جو بھیانک روپ مجھے دکھایا ہے وہ اس قدر خوفزدہ کر دینے والا ہے کہ اگر میں اسے بیان کرنے لگوں تو زبان مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے اور سارے لفظ ایک ایک کر کے جیب کے قلعے میں مقید ہو جاتے ہیں۔"

اور میری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس صورت حال میں خود کو ایڈجسٹ کیوں نہیں کر رہی ہو؟ تم تو ہر طرح کے حالات میں خود کو ڈھال لیا کرتی تھیں۔" دنیزہ نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

"ماما کہ احتشام انکل کو پاپا کی جگہ سمجھنا تمہارے لیے ذلت ناک ہے مگر یہ بھی تو سوچو کہ تمہاری ماما کو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔ اتنا وسیع و عریض کاروبار چلانے کے لیے انہیں کسی ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی جبھی تو احتشام انکل کو انہوں نے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔" وہ بڑے معصومانہ انداز میں میری دلجوئی کر رہی تھی۔

"تو وینزہ جانو کاش میری ماما اتنی ہی بے بس' معصوم اور لاچار ہوتیں۔ مگر وہ تو آستین میں چھپا ایسا زہریلا سانپ نکلیں جنہوں نے موقع ملتے ہی میرے پاپا کو ڈس لیا۔" میں نے ٹھنڈی یخ چائے کا بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اپنے اندر ابلتے لاوے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"آج سینڈوچ بہت مزے کے ہیں۔" میں نے ٹانگ پر ٹانگ جماتے ہوئے مزے سے کہا تو مسلسل بولتی ہوئی وینزہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک ہی بے تحاشا غصہ امڈ آیا تھا۔

"یہ لو پکڑو — انہیں بھی ٹھونس لو۔" اس نے اپنے سامنے سے پلیٹ اٹھا کر میرے سامنے پٹخی اور اپنی فائل' بیگ اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتی باہر کی طرف بڑھی۔

"ارے کہاں بھئی؟ بات تو سنو۔" میں بوکھلا کر اس کے پیچھے لپکی۔

"وینزہ پلیز رکو تو۔" میں بھاگ کر اس کے برابر پہنچی۔

"کوئی ضرورت نہیں مجھے بلانے کی۔" اس نے اچھا خاصا ڈپٹ کر کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنا بیگ ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ سے چھڑایا تھا جسے پکڑ کر میں اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی اگرچہ غلطی میری ہی تھی اور وینزہ کو ناراض ہونے کا حق بھی تھا مگر اس کے باوجود اس کی بات سن کر میں اپنی جگہ پر چپ سی کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی تھی اور میں نجانے کس پر غصہ ہوتے ہوئے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سامنے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ بھوری زمین کو گھورتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی جب کوئی [illegible] ہوا۔

"چلو گھر چلیں۔" اس کی [illegible] ساتھ ساتھ مفاہمت کا انداز [illegible] کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی [illegible] گھماتی اس کے پیچھے چل دی [illegible]

♥ ♡ ♡ ♥

سیاہ بادل کسی بے سمت مسافر [illegible] دیس سے بھولے بھٹکے آئے تھے [illegible] صورت بارش کی سوغات دھرتی کو [illegible] منزل کی طرف رواں ہو گئے تھے۔ [illegible] اناڑی رقاصہ کی طرح پائل چھنکاتی [illegible] بڑی مہارت اور تندہی سے زمین پر [illegible] تھی گھر کی نم آلود سفید چادر نے بڑی نرمی [illegible] پتوں اور درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا [illegible] کی دبیز کھڑکیوں کے شیشوں اور گلاس ڈور [illegible] کر بڑی شرارت سے کمرے کے گرم ماحول [illegible] لے رہی تھی۔ ایسی صورت میں یونیورسٹی جانا [illegible] کسی حماقت سے کم معلوم نہیں ہو رہا تھا سو میں نے [illegible] پر اپنے یونیورسٹی نہ جانے کی اطلاع دے کر میں [illegible] کمبل میں مزید سمٹ گئی تھی۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وینزہ نے میرے فیصلے کو بہت سراہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گھر آنے کی دعوت بھی دی تھی جسے میں خود کو کہیں جانے پر [illegible] پا کر سہولت سے رد کر چکی تھی اور اب نجانے کتنی دیر سے میں ایک ہی زاویے میں — کھڑکی سے باہر وسیع و عریض لان پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ پاپا کو یہ موسم بے حد پسند تھا۔ ایسی ٹھٹھرا دینے والی سردی میں جب ماما اپنے فل ہیٹڈ روم میں بند ہو کر رہ جاتیں اور میں بہت سے کمبلوں میں گھسی سردی' سردی چلا رہی ہوتی تو پاپا بڑے مزے سے کافی کا بڑا سا مگ ہاتھ میں لیے گلاس وال کے قریب راکنگ چیئر پہ جا بیٹھتے اور پھر کتنی ہی دیر تک ان کی نگاہیں کبھی آسمان کی وسعتوں پہ دوڑتے سرمئی بادلوں میں الجھتیں تو کبھی لان میں سبز گھاس پر جم کر رہ جاتیں جس پر سفید کہر بے رحمی و

[illegible] وال تھی میں اپنے کمرے سے [illegible] ان کے پاس آ کر کشن پہ ڈھیر ہو [illegible]

[illegible] اتنی دیر سے۔" میں ان کے [illegible] پوچھتی وہ ایک لمحے کے لیے [illegible] اور پھر ایک بہت مدھم سی [illegible] لبوں کو چھو جاتی اور اس [illegible] محسوس ہوتی کہ مجھے خود بخود یہ [illegible] لگتا ہے پاپا اس ٹھنڈے یخ ماحول میں [illegible] تھے وہ تو کسی کٹھن راستے کی مسافت [illegible] نے اپنی روح کے تمام تر دکھوں' نا تمام [illegible] بھرپور یاسیت کا بوجھ اٹھائے اور جیسے [illegible] وہ ایک دم اس سفر سے لوٹ تو گئے [illegible] کو اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر پا رہے [illegible] اپنے ہی دل میں ابھرنے والے خیالات کی [illegible] گھبرا کر پھر سے انہیں پکارنے لگتی اور اپنی [illegible] باتوں سے ان کا دل بہلانے لگتی۔

"پاپا نا میں نا آپ کو اس موسم میں کون سی چیز [illegible] سے زیادہ انسپائر کرتی ہے؟" میں ان کا بازو ہلا کر [illegible]

"[illegible] شانزے ڈارلنگ مجھے سردی کا موسم پورا کا پورا [illegible] بے حد اچھا لگتا ہے۔ اپنے آغاز سے اختتام تک اس موسم کا ہر دن مگر مجھ پر عجیب انداز سے اثر انداز ہوتا [illegible]

بدن کو کپکپا دینے والی سرد سرسراتی ہوائیں
اپنے پورے قد سے کھڑے نیم خوابیدہ درخت
یوکلپٹس کے پتوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی کہر
اداس افسردہ شام میں گھلی یاسیت آمیز خاموشی
سیاہ گھور راتوں کا جاگتا طلسم
اور
مجھے بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھار اپنی جھب
دکھلاتا پورا چاند۔

میں تمہیں کیا بتلاؤں شانزے ڈیئر کہ مجھے اس موسم کی کون سی ادا سب سے زیادہ بھاتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہتے۔

"لیکن پاپا آپ نے رگوں میں خون جما دینے والی اس ٹھنڈک کا تو ذکر ہی نہیں کیا جو اس وقت مجھ پر پوری طرح قابض ہے۔" میں کپکپاتی آواز میں کہتی تو جواباً وہ زور سے ہنس پڑتے۔

"ایسی صورت میں آپ کو ہرگز یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اپنے کمرے میں جا کر ہیٹر آن کر کے گرم گرم چائے کا لطف اٹھانا چاہیے۔"

"مگر آپ بھی تو یوں ہی بیٹھے ہیں۔ اتنی سردی میں اگر آپ کو ٹھنڈ لگ گئی تو؟" مجھے فوراً ان کی فکر پڑ جاتی۔ کھدر کا سوٹ اور اس پر ایک گرم چادر یہ لباس اس موسم کے لیے ناکافی تھا۔

"بیٹا جانی آپ کے پاپا اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ اتنی سی سردی برداشت نہ کر سکیں ابھی اس بدن میں اتنی حرارت موجود ہے کہ یہ اس موسم سے نبرد آزما ہو سکے۔"

پاپا کہتے اور میں ان کے سرخ و سفید چہرے کو بڑے پیار سے دیکھنے لگتی۔ واقعی پاپا اس عمر میں بھی اتنی شاندار شخصیت کے مالک تھے کہ انہیں دیکھ کر بغیر جانے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں۔ خود مما اب تک اتنی ایکٹو اور پرکشش تھیں کہ مجھ سے محض چند سال بڑی دکھائی دیتی تھیں۔

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں پاپا۔ بھلا اتنے اسٹرونگ مین کو یہ چھوٹے موٹے موسم کہاں شکست دے سکتے ہیں۔" میں بڑے فخر سے ان کو دیکھتی ہوئی وہاں سے اٹھ جاتی اور یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بعض اوقات بلند و بانگ، عظیم الشان عمارتوں کو گھن اندر ہی اندر اس طرح چاٹ جاتا ہے کہ وہ تیز آندھی کے پہلے تھپیڑے سے ہی زمین بوس ہو جاتی ہیں اور پاپا آپ کے شاندار جسم کو ڈھانے کے لیے بیرونی عناصر دشمنی پر نہیں اترے تھے۔ آپ کو تو آپنے ہی کیے گئے فیصلوں کا گھن چاٹ گیا اور رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے تو آپ کے گرد لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔"

میں جیسے تھک کر بینچ سے نیچے اتر آئی۔ کمرے کی گرم فضا بے حد بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ بے اختیار ہی میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ نادانستہ میرے قدم لونگ روم میں گلاس وال کے سامنے رک گئے۔ شیشے کی بے جان، سرد اور ... پر پیشانی ٹکا کر میں نے باہر جھانکا۔

ذرا سی ہوا چلتی تو کونفیرز کے پتوں پر بھی گری شبنم قطروں کی صورت زمین پہ گرتی تو آہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ خاک بسر زمین پر سبزے کی چادر اوس کے موتیوں سے بھی ہوئی تھی۔ نیم خوابیدہ درخت اپنے پورے قد سے کھڑے تھے۔ ہوا ابھی بھی چل رہی تھی اور فضا میں گھلی اداس، افسردہ خاموشی بھی۔ میری نظریں بھٹکتی ہوئی راکنگ چیئر پر جا کر ٹھہریں تھیں اس پیارے سے، شفقت محبت بھرے وجود سے خالی میرا دل کہیں گہرائی میں جا گرا تھا۔

"نجانے یہ موسم اس جگہ ٹھہر سا کیوں گیا ہے؟ شائد یہ اپنے اس ساتھی کا منتظر ہے جس کے ساتھ اس نے سیاہ گھور راتوں کے طلسم میں جاگنا تھا اور گھنے بادلوں میں چھپے چاند سے آنکھ مچولی کھیلنی تھی اور مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ جا کر ان ہواؤں، درختوں اداس شاموں کو۔۔۔ یہ کہہ سکوں کہ۔

"سنو! وہ مسافر ایک مرتبہ پھر اپنی روح کے تمام تر دکھوں، ناتمام خواہشوں اور بھرپور یاسیت کا بوجھ اٹھائے ایک کٹھن سفر کی مسافت طے کرنے نکلا ہے اور اب میرے پکارنے پر بھی واپس نہیں لوٹتا۔" میں راکنگ چیئر پر گر گئی تھی اور اس لمحے پاپا مجھے بہت شدت سے یاد آئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"مجھے جمشید آفندی سے ملنا ہے۔" دارالاطفال ـــــ کے سیاہ، آہنی بلند و بالا گیٹ کے سامنے مستعد کھڑے چوکیدار سے میں نے کہا تو اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا تھا۔

"آپ یہاں سے سیدھی سامنے چلی جائیں۔ کوریڈور کے پہلے کمرے میں مسٹر عاصم بیٹھے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں وہ آفندی صاحب کے سیکرٹری ہیں۔"

اس کے بتانے پر میں سرخ روش پر چلتی ہوئی اس

... دروازہ اگرچہ کھلا تھا مگر پھر بھی میں ... اندر داخل ہوئی تھی فائل میں منہمک ... سر اٹھا کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر

... رکھے۔" اس نے گولڈن چین ہولڈر ... ہوئے مہذبانہ اور شائستہ لہجے میں کہا تو ... سنبھالتے ہوئے اسے اپنی آمد کا مقصد

"... انہوں نے آپ کو وقت دے رکھا ہے؟"

"... نہیں انہوں نے یہ کارڈ مجھے دیا تھا اور کہا تھا ... کسی وقت بھی آجاؤں۔" میں نے ہاتھ میں ... ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف کھسکایا جس پر ... سرسری سی نظر ڈال کر دوبارہ میز پہ رکھ دیا تھا۔

"وہ ابھی آتے ہی ہوں گے آپ کو کچھ دیر انتظار ... گا۔" اس نے کہتے ہوئے دوبارہ فائل کھول ... اور بڑے رسمی سے انداز میں چائے کا بھی پوچھا ... میں نے شکریہ کے ساتھ ٹال دیا تھا اور کمرے کا ... جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی تھی آج کمرے میں بند رہنے ... بعد میں سخت اکتا کر باہر نکلی تھی یونیورسٹی میں ... ایک تو کلاس اٹینڈ کی تھی وہ نیزہ بھی موجود نہیں تھی ... وہاں سے جلد ہی لوٹ آئی تھی اور یوں ہی سڑکوں پہ ... آوارہ گردی کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی جب ڈیش ... بورڈ پہ پڑے اس وزیٹنگ کارڈ پہ نظر جا پڑی تھی۔ پھر ... کچھ سوچتے ہوئے میں نے گاڑی مطلوبہ سڑک پر ڈال ... دی تھی اور اب میں جمشید آفندی کے انتظار میں ... یہاں بیٹھی تھی۔ پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد میں اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی جب اچانک کھلے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ دراز قد اور گھونگریالے بالوں کو دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس روز یہ ہی شخص مجھے سڑک پر ملا تھا اور یقیناً "یہ جمشید آفندی ہی تھا۔

اس کی آمد پر عاصم مودبانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا جمشید آفندی بڑے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے سنجیدگی سے کچھ ہدایات دے رہا تھا جسے وہ بڑی توجہ سے سن بھی رہا تھا جبکہ میں یہ دیکھ رہی تھی کہ عاصم کی اچھی خاصی شخصیت جمشید آفندی کے سامنے دب سی گئی تھی۔

"ہاں بعض لوگ ہوتے ہیں ناں ایسے جو کسی بھی ماحول پر چھا جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"سر یہ محترمہ آپ سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔" عاصم کی آواز پر میں چونک گئی۔ اس نے سرسری سے انداز میں مجھے دیکھا۔ شناسائی کی کوئی چمک اس کی آنکھوں میں نہ ابھری تھی۔

"ہوں۔ انہیں میرے کمرے میں بھیج دو۔" وہ اپنی بھاری جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ نجانے کیوں میرے دل میں ناگواری کی کوئی لہر اٹھی تھی اور ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں اس شخص سے کوئی بات کیے بغیر ہی لوٹ جاؤں مگر چونکہ یہ بھی کچھ مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے اگلے لمحے میں اس کے آفس میں موجود تھی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں ایک ضروری فون کر لوں۔" اس نے گویا اطلاعاً "پوچھا تھا۔ جواباً" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"تھینک یو آپ اس وقت تک چائے سے لطف اندوز ہوں۔" اس نے چائے لے کر کمرے میں داخل ہوتے ملازم کو دیکھ کر کہا اور خود فون پر بزی ہو گیا۔ چائے کا بھاپ اڑاتا کپ میرے سامنے تھا مگر میرے لیے اس شخص کا جائزہ لینا زیادہ لطف انگیز ثابت ہوا تھا۔ بہ نسبت چائے کے۔ اس کے گھونگریالے، بے ترتیب بال بڑی شان سے اس کی کشادہ پیشانی پہ براجمان تھے اور اس کی آنکھیں۔۔۔ میں نے دونوں کہنیاں میز پہ ٹکا کر آگے کو جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ہاں سبز جھیل سی جادوئی آنکھیں مسحور کر دینے والی طلسماتی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی ہی پراسرار کشش تھی۔ بہت نامانوس کی... میری نظریں بھٹکتی ہوئی عنابی ہونٹوں کے بالکل برابر دائیں گال پہ

معصوم سے تل پر جا پڑیں۔ جو اس کے ہونٹوں کے ساتھ ہی مسکرا اٹھتا تھا۔ اس کی بھاری اور جاندار آواز میں نرمی کا تاثر غالب تھا اور اس کی سبز رگوں کی جھلک دکھاتے سرخ و سفید ہاتھ میں دبے قلم کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے خیال آیا تھا کہ ان ہاتھوں میں برش ہونا اسے دیکھ کر خود بخود میرے ذہن میں کسی مصور کا خیال ابھر آیا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت بے حد متاثر کن اور بھرپور تھی۔

ریسیور رکھتے ہوئے وہ ہلکا سا کھنکارا تھا اور پھر سامنے پڑی فائلیں ایک طرف کھسکاتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی مجھے شانزے ایمان کہتے ہیں۔"

"ہوں پہلے تو یہ بتایئے مس شانزے ایمان کہ اپنے آنسوؤں سے کب کنارہ کش ہو رہی ہیں آپ؟"

گویا وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

"جن کے دلوں میں سمندر آ ٹھہرا ہو آفندی صاحب وہ آنسوؤں سے کبھی بھی کنارہ نہیں کر سکتے۔" میرے کہنے پر اس نے چند لمحوں کے لیے بغور میرے چہرے کو کھوجا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم مس شانزے کہ آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے کیا پریشانی ہے بلکہ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ کے ساتھ کوئی پرابلم ہے بھی یا آپ اپنی کلاس کے اور بہت سے لوگوں کی طرح شوقیہ فرسٹریشن کا شکار ہیں۔ ہاں البتہ اس بات سے واقفیت ضرور رکھتا ہوں کہ بعض اوقات کوئی دکھ، کوئی غم ہمارے دل میں اس طرح مستقل گھر کر لیتا ہے کہ پھر کسی طور اس گھر سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اسے دربدر کرتے کرتے ہم خود نڈھال ہو جاتے ہیں۔ اس روز آپ کو دیکھا تو ایسی ہی تھکن آپ کے چہرے سے جھلکتی دکھائی دی۔ ہو سکتا ہے مجھے سمجھنے میں غلطی بھی ہوئی ہو کہ بہرحال میں خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اس روز میں خود کو روک نہیں سکا تھا اسی لیے بے اختیار آپ کو یہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔"

وہ پوری توجہ سے پیپر ویٹ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"چلیے مان لیتے ہیں کہ آپ کا [illegible] درست ہے۔" میں نے بڑی بے [illegible] اگرچہ دل میں اس کے سو فیصد درست [illegible] ہو چکی تھی۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ یتیموں اور [illegible] کی پناہ گاہ میں آ کر مجھے کیا حاصل ہو گا [illegible] قسم کے سوشل ورک سے کوئی دلچسپی [illegible] میں چونکہ اس کی بات سمجھ نہیں پائی [illegible] صاف گوئی سے کہہ دیا جواباً وہ ذرا سا مسکرایا [illegible]

"میں سمجھتا ہوں اپنے غم کو غلط کرنے [illegible] طریقہ یہ ہے کہ اسے دوسروں کے غم میں [illegible] جائے جس طرح ایک قطرہ سمندر میں جا کر [illegible] دیتا ہے اسی طرح اس کائنات میں بکھرے [illegible] دکھوں میں آپ کا غم آپ کو بہت حقیر نظر آئے [illegible] شاید آپ کو یاد نہیں میں نے کہا تھا یہاں زندگی ہنستی کھلکھلاتی ملے گی آپ کو۔ ہاں اگر آپ [illegible] چاہتی ہیں تو وہ آپ کو واقعی یہاں سے نہیں ملے گی" اس نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔

"ہونہہ زندگی اور وہ بھی ہنستی کھلکھلاتی۔" میں تمسخرانہ انداز میں مسکرائی۔

"مسٹر جمشید آفندی کہیں آپ جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تو نہیں۔" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر طنز کیا تو لمحہ بھر کو وہاں سکوت سا چھا گیا۔

"خواب کسے کہتے ہیں مس شانزے ایمان۔" اس نے کرب آمیز معصومیت سے سوال کیا تھا۔

"میرا کبھی خواب نامی چیز سے واسطہ نہیں رہا۔ حقیقت کبھی آنکھوں سے اوجھل ہی نہیں ہوئی تو خوابوں کو جگہ کہاں سے ملتی۔" اس نے آخری جملے جیسے خود سے کہے تھے۔ مجھے لگا وہ شخص ایک لمحے کے لیے کہیں کھو گیا تھا اور پھر پلٹ آیا تھا۔

"بہرحال میڈم میں آپ کو یہاں آنے پر مجبور تو نہیں کر رہا آپ کی مرضی ہے دل چاہے تو آ جایئے گا۔ نہ آنا چاہیں تو کوئی زبردستی نہیں۔" وہ ایک دم بہت

[illegible] دیکھتے دیکھتے گئی ابھی چند لمحے قبل [illegible] نظر آنے والا شخص اپنے چہرے پر [illegible] جائے فائل کھولنے میں مصروف [illegible]

[illegible] "میں سر جھٹک کر اٹھ [illegible] حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے اس کے "نظریہ" [illegible] زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔

[illegible] اپنی ذات کے گنبد میں قید ہے [illegible] کے آنسو بھی پونچھ رہا ہے تو میں [illegible] اس میں اس کی کوئی غرض پوشیدہ [illegible] ریڈور سے گزرتے ہوئے اس بڑی سی [illegible] دیکھا جہاں ایک ہاتھ 'ایک معصوم بچے کے [illegible] آنسوؤں کو صاف کر رہا تھا۔

[illegible] اپنی آنکھوں سے انتہائی قریبی رشتوں کو [illegible] طرح پھن پھیلائے ڈستے دیکھا ہے ایسی [illegible] میں تمہاری ہنستی کھلکھلاتی زندگی کا فلسفہ [illegible] کی بڑ سے زیادہ کچھ نہیں مسٹر جمشید [illegible] میں نے سیاہ آہنی گیٹ سے باہر نکل کر اپنی [illegible] کا ڈور لاک کھولتے ہوئے سوچا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"دار الاطفال" سے نکل کر میں نے بے مقصد [illegible] سڑکیں روند ڈالی تھیں اور پھر لائبریری کی [illegible] میں لپٹی سفید عمارت کو دیکھ کر میں نے گاڑی روک لی تھی۔ لائبریری کا اندرونی ماحول باہر کی نسبت [illegible] گرم اور پرسکون تھا۔ بہت سے لوگ کتابیں کھولے یوں گم تھے گویا ہر لفظ میں ایک نئی دنیا دریافت کر رہے ہوں۔ کچھ لمحے گزرے اور پھر میں بھی نئی دنیاؤں کو کھوجنے لگی اور جب ان جانی انجانی زمینوں پر گھومتے پھرتے میرے قدم تھکنے لگے تب میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر جگمگاتے نیون سائن جگمگا رہے تھے اردگرد عمارتوں میں ننھی منی روشنیاں بڑے اشتیاق و معصومیت سے بڑھتی ہوئی رونق کو دیکھ رہی تھیں اور دن کو اختتام پذیر ہوتے دیکھ کر مجھے انجانی خوشی کا احساس ہوا تھا۔

"چلو کم از کم ایک دن تو میری زندگی سے خارج ہوا۔" میں نے تھکے تھکے ذہن سے سوچا تھا جب انسان کا اس دنیا پر اعتبار باقی نہ رہے تو شاید وہ دن کے اختتام پر یوں ہی مسرت محسوس کرتا ہو گا۔ میرا گھر جانے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی اس چھ کنال کی وسیع و عریض عمارت میں مجھے "گھر" جیسی کشش محسوس ہوئی تھی۔ اس لیے اب میرا اگلا ٹھکانا "شایان ریسٹوران" ٹھہرا تھا۔ اس کے وسیع و عریض سبزہ زار میں اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ گیٹ پر البتہ آنے جانے والوں کی چہل پہل موجود تھی۔ صبح کے وقت اس سبزہ زار میں بے حد رونق ہوتی تھی۔ لوگ مختلف ڈشز اڑانے کے ساتھ ساتھ نرم گرم لطیف دھوپ کا مزہ بھی اٹھاتے تھے مگر اس وقت ساری رونق ریسٹوران کے اندرونی حصے میں منتقل ہو گئی تھی۔ گلاس ونڈوز سے اندر کے خواب ناک ماحول کا اندازہ ہو رہا تھا کینڈل لائٹ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے لوگ' ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے چہکتے کپلز مستعد باوردی ویٹرز برتنوں کی کھنک نت نئے کھانوں کا مزہ کافی کی مہک میں نے جیسے باہر کھڑے کھڑے اندرونی ماحول کو پوری طرح محسوس کیا تھا۔

"تو کیا یہ سب ہنستے مسکراتے خوب صورت اور پیارے چہرے اندر سے اتنے ہی کریہہ اور بھیانک ہیں۔" کوئی آکٹوپس ایک بار پھر میری سوچوں پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اردگرد نظر دوڑائی۔ کچھ ویٹرز لان میں لگے تمام ٹیبلز ہٹا رہے تھے۔ میں ایک قدرے الگ تھلگ میز کا انتخاب کر کے اس پر جا بیٹھی۔

"کم از کم یہاں بیٹھ کر کسی آشنا کے سامنے خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوئی بے چاری سی بے حد کوشش تو نہیں کرنی پڑے گی ناں۔" میں نے قریب سے گزرتے ویٹر کو پکار کر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر کیا وہ بے حد حیرت سے میری طرف دیکھتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ میں بے اختیار ہی مسکرا دی تھی۔

"اب میں کیا بتاؤں تمہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی تمام حسیات کو مفلوج تصور کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے نہ وہ سن سکتا ہے نہ بول سکتا ہے، نہ ہنس سکتا ہے نہ رو پاتا ہے۔ نہ دیکھ سکتا ہے نہ ہی کچھ محسوس کرنے کے قابل رہتا ہے اسے لگتا ہے جیسے کوئی بھی چیز اس پر اثر انداز نہیں ہو رہی۔ نہ کسی کے آنسو نہ مسکراہٹ نہ کسی کی ہمدردی دل کو بھاتی ہے اور نہ ہی محبت کا اظہار بلکہ کبھی کبھی تو اس بات پر بھی شک ہونے لگتا ہے کہ اس کے سینے میں دل دھڑک رہا ہے اور اب سے کچھ دیر پہلے مجھے لگ رہا تھا جیسے میری بھی تمام حسیات مفلوج ہو چکی ہیں۔ مگر اب میں یہاں بیٹھ کر خود کو اس برفاب ہوا میں ٹھٹھرتے دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں۔ گویا ابھی میں زندوں کی صف میں کھڑی ہوں۔"

میں نے گرم کافی کے بڑے بڑے گھونٹ لیے۔ اس کی گرمی نے اس سردی میں کافی سہارا دیا تھا مجھے۔

"شانزے یہ تم ہی ہو ناں؟" قدرے حیران لہجے میں کہا گیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر آنے والے شخص کو دیکھا اور کافی کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور یہ آخری گھونٹ بے حد تلخ ثابت ہوا تھا۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اتنی سردی میں۔" وہ پریشان و متحیر چہرہ لیے میرے سامنے آ بیٹھا تھا۔ میں نے ایک گہرا اور طویل سانس کھینچ کر موسم کی ساری خنکی اپنے اندر جذب کرلینی چاہی۔

"کیا بیمار ہونے کا ارادہ ہے؟" وہ اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ ارادتاً بیمار ہوتی رہی ہوں۔

"بہت بری بات ہے شانزے یہ تو سراسر خود اذیتی ہے۔"

"او گاڈ کیا دنیا کے باقی سب کام ختم ہو گئے ہیں جو ہر بندہ مجھ پر ریسرچ کرنے چلا آرہا ہے۔"

میں نے جھنجلا کر بل میز پہ پٹخا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جیسے [illegible] پیچھے چلا آیا تھا۔

"رات کافی بیت گئی ہے اب سیدھی گھر جانا۔"

"مسٹر تم میرے گارجین نہیں ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔" میں سختی سے کہہ کر گاڑی میں بیٹھی تھی اور پوری قوت [illegible] تھا میری اس حرکت پر وہ زیر لب [illegible] ایک لمحے کے لیے کھڑکی میں جھکا تھا۔

"سنو اپنا خیال رکھا کرو۔" "اس [illegible]" اس کی نگاہوں میں نرمی تھی۔ [illegible] میرا ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رکا تھا۔

"معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی یہ [illegible] کی طرح لگتا ہے۔ ویسا ہی لونگ ویسا ہی [illegible] کو ناپسند کرنے کے لیے کیا یہ جواز کم ہے کہ [illegible] احمد کا بیٹا ہے۔" میں نے سلگتی نگاہوں سے [illegible] میں ولید احتشام کے معدوم ہوتے عکس کو [illegible] تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"یہ آج کل تم کن چکروں میں پڑی ہوئی ہو [illegible]" پہنچ کر میں ابھی اپنے پاؤں بھی جوتوں کی قید سے [illegible] نہیں کرپائی تھی کہ مما میرے اعصاب پر سوار ہونے کے لیے آ پہنچی تھیں۔

"ملازمہ بتا رہی تھی کہ تم صبح ناشتا کیے بغیر ہی [illegible] گئی تھیں۔ لنچ پر بھی تم نہیں آئیں اور اب تم [illegible] کے گیارہ بجے آرہی ہو جبکہ ہم لوگ ڈنر سے بھی فارغ ہو چکے ہیں۔"

"مما! یوں مڈل کلاس لوگوں کی طرح پوچھ گچھ کرنا آپ کو قطعاً زیب نہیں دیتا اور جس کلاس سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہاں اگر کوئی فرد رات کے ایک بجے بھی گھر میں داخل ہو تو بھی یہ پوچھنا حماقت سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں سے آرہا ہے، کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا۔"

میں نے زہر خند لہجے میں انہی کے الفاظ دہرائے تھے جو وہ ہمیشہ پاپا کے سوال پر کہا کرتی تھیں ایک لمحے کے لیے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور اگلے ہی لمحے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے۔

"آر یو آل رائیٹ؟ یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو میرے ساتھ؟"

"یس آئی ایم پرفیکٹلی آل رائیٹ اور اس لہجے میں بات کرنا تو میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔"

[illegible] حیران حیران آنکھوں میں آنکھیں [illegible] سے کہا تھا اور اسی جرأت پر مما کو [illegible] کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

"[illegible] گستاخ اور بدتمیز ہوتی جا رہی ہو [illegible] یا ہے تمہارے ساتھ کیوں بچوں [illegible] رہی ہو تم؟ جب سے احتشام احمد اس [illegible] ہیں تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے اتنی [illegible] سمجھ میں نہیں آئی کہ جس کاروبار کی [illegible] نہیں آئی ہم کیسے اس کی دیکھ بھال کر [illegible] اتنا سارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا اور ایک [illegible] گاڑیاں، یہ بنگلہ اونے پونے داموں [illegible] کسی دو کمروں کے کوارٹر میں جا پڑے [illegible] میں اگر میں نے احتشام احمد سے شادی [illegible] گناہ نہیں کیا بلکہ تمہیں تو اس شخص کا شکر [illegible] ادا کرنا چاہیے جو۔"

"[illegible] آپ اتنا مما میرے سامنے اس شخص کے [illegible] پڑھنے سے بہتر ہے کہ آپ اس احتشام احمد [illegible] سامنے جائیں اور جی بھر کے اس کی شکر گزار ہو [illegible] بدلے میں آپ کو مزید آزادی مل سکے۔ آپ [illegible] من مانیاں کر سکیں اور وہ بھی میرے پاپا کی طرح آپ پر روک ٹوک کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

میں نے شدید غصے میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے بمشکل کہا اور پھر بھاگ کر زینوں پر آ گئی کہ اگر میں وہاں کھڑی رہتی تو شاید اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکتی۔

"کاش کاش میں کہیں چھپ سکوں کسی ایسی جگہ جہاں اس عورت کی پرچھائیں بھی مجھ تک نہ پہنچ سکیں جو بدقسمتی سے میری ماں کہلاتی ہے۔" ٹھنڈی [illegible] بیڈ سے پشت ٹکا کر میں نے پوری شدت سے خواہش کی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

بعض لوگوں کی زندگی میں خوشیوں کا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی میں سے ان ادھوری، نا تمام خوشیوں کا حصہ بھی ختم ہو گیا ہے جو کبھی پاپا کی زندگی میں مجھے نصیب تھیں۔

شاید اسی کو مقدر کا بانجھ پن کہتے ہیں کہ آپ نہ جرم کرنے والوں میں سے ہوں نہ جرم سہنے والوں میں، مگر جب فیصلہ آئے تو معلوم ہو کہ ساری کی ساری سزا آپ کے حصے میں آگئی ہے۔

خوشیوں کی، خوابوں کی، خواہشوں کی، مسکراہٹوں کی عمر قید کی سزا۔

ہر پل ذہن و دل پہ پڑنے والے یاد کے کوڑوں کی سزا۔

مال و متاع چھن جانے کی سزا۔

اور سب سے اذیت ناک سزائے موت، جو جسم کو نہیں روح کو سہنی پڑتی ہے۔

اور بے چاری روح سانسوں کو پھندا گلے میں ڈالے عمر بھر زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہ جاتی ہے۔

"تو کیا میں بھی اپنے قدم کبھی زمین پر نہیں جما سکوں گی۔" کوئی خوف دھیرے دھیرے میرے وجود پہ سایا کرنے لگا تھا۔ میں بے چین سی ہو کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" بہت احتیاط سے کیوٹکس لگاتی ونیزہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مضمحل سے انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"میرا خیال ہے اب تم شاور لے لو کچھ دیر میں مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔"

اس کے کہنے پر میں نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آج اس کی منگنی کا فنکشن تھا اس لیے میں یونیورسٹی سے سیدھی یہیں چلی آئی تھی اور حسب توقع مجھے سامنے پا کر پھپھو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر مجھے سینے سے لگائے، پیشانی پہ پیار کرتے ہوئے پاپا کو یاد کرتی رہیں۔ پاپا، پھپھو سے چھوٹے تھے مگر ہمیشہ انہوں نے بڑے بھائی کی طرح پھپھو کا خیال رکھا تھا اور پھر چونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا اس لیے ان کی آپس کی محبت کی بھی مثال نہ ملتی تھی۔ پھپھو کے اس طرح رونے پر پاپا کی یاد جیسے ایک دم تازہ ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں ہم

میں اردگرد کے ماحول سے بے نیاز چائے کے کپ
پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جب ونیزہ نے مجھے ٹہوکا
دیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا کہہ رہی تھی۔ میں
نے اثبات میں سر ہلا کر نظروں کا زاویہ بدلا تو اس لمحے
مجھ پر انکشاف ہوا کہ کمرے کی دائیں طرف کا دروازہ جو
نیم دراز احتشام احمد کی زیرک نگاہیں میرے چہرے کو
کھوج رہی تھیں۔ میں طویل سانس لے کر ان پر سے
نظریں ہٹا کر ونیزہ کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ونیزہ کی منگنی کی خبر پورے ڈیپارٹمنٹ میں پھیل
چکی تھی یہی وجہ تھی کہ کلاس روم میں قدم رکھتے ہی
"ٹریٹ" کے فلک شگاف نعرے سے گھبرا کر ہم دونوں
باہر نکل آئی تھیں۔
"ارے ارے بھاگ کہاں رہی ہو تم لوگ۔" علی
بھاگ کر ہم لوگوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔
"منگنی کی ہے تم نے کوئی جرم نہیں کیا جو یوں فرار
ہو رہی ہو۔" مدیحہ اپنی سیٹ پر سے چلائی تھی اور ونیزہ
منہ بنا کر کلاس روم میں داخل ہوئی تھی۔
"اوفوہ لگتا ہے ونیزہ کو انگوٹھی پسند نہیں آئی۔"
حیدر حسب عادت روسٹرم کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔
"تم سے کس نے کہا؟" ونیزہ نے اسے گھورا۔
"تمہاری شکل دیکھ کر تو کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔"
"جی نہیں آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے جناب
انگوٹھی بھی بے حد پیاری ہے اور۔۔۔" اس کے
ادھورے جملے پر حیدر کھنکار کر سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا
تھا۔
"مگر واقعی تمہارے فیانسی بھی اتنے ہی پیارے
ہیں جتنی یہ رنگ تو پھر ہم ڈبل ٹریٹ لیں گے کیوں
شانزے؟" رائمہ نے پہلے بغور ونیزہ کی انگلی میں پہنی
رنگ دیکھی اور پھر مجھ سے رائے طلب کی اور میری
[illegible] ونیزہ [illegible] تھی۔
"[illegible] لو۔"
"[illegible] بھی میں اس معاملے میں پوری طرح
[illegible] ساتھ ہوں۔" میرے کہنے پر ونیزہ نے ہتھیار
[illegible] ڈیپارٹمنٹ پروفیسر

رانا صادق صاحب سے اجازت لے کر انہیں دعوت
دے کر یونیورسٹی میں ہی چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کر لیا
گیا تھا اور بہت احتیاط سے کام لیتے لیتے بھی اچھا خاصا
ہنگامہ ہو گیا تھا۔ نوید چپکے سے ارسلان کا کیک پیس چرا
کر سیدھا ہوا تھا تو اس کی پلیٹ سے کیک غائب تھا۔
نیلم اس بات پر شور مچا رہی تھی کہ فہد نے بڑا کے
پورے چار پیس کھائے ہیں جبکہ باقی سب کے حصے
میں صرف دو دو پیس آئے تھے۔ سب اسٹوڈنٹس کے
اصرار پر کسی گرم مشروب کی جگہ پیپسی کا انتظام کیا گیا
تھا اور اس موسم میں جبکہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا
تھا اور سرد ہوا جسم سے ٹکرانے پر بے اختیار
جھرجھری سی آ جاتی تھی جب پیپسی سب کے ہاتھوں
میں آئی تو جی بھر کے اس شخص کو گالیوں اور [illegible]
سے نوازا گیا جس نے سب سے پہلے اس کی
فرمائش کی تھی بلکہ سب لوگوں کو ورغلایا بھی تھا۔
"بھئی پی لو سب لوگ پارٹی کے اختتام [illegible]
چائے میری طرف سے۔" ارسلان نے [illegible]
خبر پر لات مار کر سب کو خوش کر دیا تھا اور [illegible]
کاموں سے فارغ ہو کر پوری یونیورسٹی [illegible]
خواہش نوید نے ظاہر کی تھی اور شاید [illegible]
کی بے تکی حرکتوں تھا جبھی تو ہر کوئی [illegible]
ٹاکلہ نے محروم کھانے کی کوشش کی [illegible]
میں کھو گیا۔
"جو نہیں آئے گا اسے ہم [illegible]
گے۔" وہ دونوں کزنز تھے اور [illegible]
انٹرسٹڈ بھی تھے اسی لیے ایک [illegible]
جتایا کرتے تھے۔
"یار اس طرح واک کرنے [illegible]
کا تو ا تا بھی ہونا چاہیے۔" [illegible]
کے لیے جیکٹ کے کالر [illegible]
"جی ضرور اسی [illegible]
جناب علی شیر کو۔" ارسلان [illegible]
تھمایا۔ علی نے بڑا سا [illegible]
گانے لگا۔

ایسا کبھی

یوں بے وفا ہو جاؤ گے
آگ لگا کر دل میں میرے
اور کسی کے ہو جاؤ گے

وہ ونیزہ کے عین سامنے الٹے قدموں چلتے ہوئے
بے حد دکھ سے گا رہا تھا۔
"سنو کہیں یہ ونیزہ میں انٹرسٹڈ تو نہیں تھا۔" گانے
کے بول سے متاثر ہو کر میں نے بڑی دکھ بھری حیرت
سے پوچھا۔
"پریشان مت ہونا سسٹر یہ ہر لڑکی کے انگیج
ہونے پر یوں ہی افسردہ ہوتا ہے۔"
حیدر نے تسلی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے مٹھی بھر
[illegible] اپنی جیب سے میرے ہاتھ پر منتقل کیے اس
بات پر [illegible] سب ہی بے اختیار ہنس دیے تھے اور
اس خوشگوار پارٹی کے اختتام پر میں ونیزہ کو ڈراپ
کر کے جب روڈ تک آئی تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ
اپنے بستر میں گھس جاؤں گی اور پھر ایک لمبی
[illegible]

اس کے بعد مجھے اس مخصوص پریشان کن مسرور
[illegible] ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا، جو پاپا کی ڈانٹ کے
[illegible] مجھے اپنے کمرے میں لیے رکھتی
[illegible] اس تبدیلی کو یقیناً" ونیزہ نے بھی محسوس
[illegible] اس تمام عرصے میں بغور میرا جائزہ لیتی
[illegible] مسکراہٹ جبراً" میرے ہونٹوں پہ
[illegible] خوشی دل سے بھی پھوٹی ہے
[illegible] مسئلہ ہے کہ جو لوگ ہماری رگ رگ
[illegible] ہیں انہیں ہم کسی صورت دھوکا
[illegible] تجربہ ہے کہ خود کو چھپانے کی
[illegible] سنگی میں ہم ایسے پیاروں
[illegible] ہیں جو درحقیقت ہمارے
[illegible] بارے میں ہمیں یقین ہوتا
[illegible] بھی چاہیں تو وہ با آسانی دھوکا
[illegible] اطمینان کی خاطر۔۔۔"

[illegible] میں سے ہے جس سے
[illegible] سب خود بخود اس پر

عیاں ہو جاتا ہے۔
میں لاشعوری طور پر ہی اس کے متعلق سوچے جا
رہی تھی۔ تب ہی اچانک سیاہ چادر میں لپٹی لپٹائی
عورت ایک دم گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔ فوری طور
پر میرا پاؤں بریک پہ نہ جاتا تو گاڑی اس کے اوپر سے
گزر جاتی۔ گاڑی کے وہیل پوری قوت سے
چرچرائے تھے اور آتے جاتے کئی راہگیروں کو متوجہ کر
گئے تھے اس احتیاط کے باوجود گاڑی ہلکی سی اس
عورت سے ٹکرائی تھی اور وہ اچھل کر کچھ دور جا گری
تھی۔
"او گاڈ۔" حادثہ اچانک ہی ہوا کرتا ہے مگر چونکہ
میرے ساتھ یہ پہلا واقعہ ہوا تھا اس لیے میں بے حد
متوحش ہو کر اس عورت کی طرف لپکی تھی۔ اس کے
قریب ہی ایک بچہ اوندھے منہ گر کر زور و شور سے رو
رہا تھا۔ غالباً" وہ بچہ عورت نے چادر کے نیچے چھپا رکھا
تھا جبھی اس بچے پر میری نظر نہیں پڑی تھی۔ بہرحال
اسے کسی راہگیر نے اٹھا کر سیدھا کیا اور میں اس
عورت کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی
تھی۔ بظاہر تو کسی چوٹ کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے
وہ غالباً" خوف کی وجہ سے ہی بے ہوش ہوئی تھی۔
اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اپنے گرد
جمع مجمعے کو دیکھا اکثر لوگوں کے چہروں پر ناگواری
ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسی ہی ناگواری جو ایسے
موقعوں پر گاڑی میں سوار کسی بھی فرد کے خلاف پیدل
چلنے والوں کے چہرے پر با آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔
"پلیز اسے اٹھانے میں میری مدد کریں تاکہ میں
اسے ہاسپٹل لے جا سکوں۔" میں نے مدد طلب
نظروں سے ان لوگوں کو دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر شخص
فوراً" آگے بڑھ آیا۔ اس عورت کو گاڑی کی پچھلی
سیٹ پر لٹا کر میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لی۔ اس کا بچہ
میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔
میں نے ایک دو بار پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر
چپ کروانے کی کوشش کی مگر وہ بہت سہما ہوا تھا۔ وہ
بمشکل ڈھائی، تین سال کا ہی تھا اور روتے ہوئے بار
بار پلٹ کر ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہچکیوں اور متواتر

بہتے آنسوؤں نے مجھے قدرے بوکھلا دیا تھا۔ اس لیے
جس پہلے پرائیویٹ کلینک پر میری نظر پڑی تھی میں
نے وہیں گاڑی روک دی تھی۔

"صرف کمزوری کی وجہ سے اتنی دیر بے ہوش رہی
ہے ورنہ کوئی چوٹ وغیرہ نہیں آئی کیوں بی بی کہیں درد
یا تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی۔"

ڈاکٹر کے پوچھنے پر اس عورت نے نفی میں سر ہلا دیا
تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی ہوش میں آئی تھی۔ اس کی
رنگت ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ بچے کو گود میں
لے کر اس نے تھپکنا چاہا مگر وہ مسلسل ریں ریں کیے
جا رہا تھا۔

"بچے کو ٹھیک طرح سے چپ کروا دو کب سے
روئے جا رہا ہے۔" مجھے اسے ٹوکنا پڑا تھا۔ مگر کچھ دیر
بعد میں نے محسوس کیا کہ بچے کی پیشانی پہ ہونٹ
رکھے وہ رو رہی تھی مجھے اس سے بے حد ہمدردی
محسوس ہوئی تھی۔

"سنو کیا بات ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اس
کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر نرمی سے پوچھا۔

"باجی یہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہے اور میرے
پاس----" باقی کی ساری بات اس نے آنسوؤں کی
زبانی کہی تھی۔ اس کی بات سمجھ کر میں نے وہاں کے
ایک ملازم سے کچھ فروٹ وغیرہ منگوایا اور جس طرح
بچہ ٹوٹ کر کھا رہا تھا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کئی پہروں
سے بھوکا تھا۔

"اب مجھے اپنا ایڈریس بتا دو تاکہ تمہیں وہاں تک
چھوڑ آؤں۔" کلینک سے باہر نکلتے ہوئے میں نے
پوچھا تو اس کی ویران آنکھیں ایک بار پھر بھیگ
گئیں۔

"باجی میرا کوئی گھر نہیں میں کہاں جاؤں۔" آنسو
ایک بار پھر اس کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں یتیم و بے آسرا تھی اور اب بیوہ بھی ہو گئی
ہوں باجی پتہ نہیں میرے مقدر اتنے سیاہ کیوں ہیں۔
سسرال والوں نے برداشت نہیں کیا گھر سے نکال دیا
ہے۔ اب تم ہی بتائیں میں کہاں جاؤں؟ کس گھر کا پتہ
بتاؤں؟" اس نے فٹ پاتھ پہ بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے
گرد لپیٹے تھے اور ٹوٹ کر رونے لگی تھی۔

"پتہ نہیں رب نے مجھ کالے نصیبوں والی کو کیوں
بھیج دیا اس دنیا میں، مر گئی ہوتی میں بھی اسی دن، جب
ماں باپ کا سایہ مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ ہائے ماں
کہاں کہاں خوار ہو گی تیری بیٹی۔"

وہ عورت جیسے ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس
عورت کو اپنی حیاتی نصیب پہ ماتم کرتے دیکھ کر میرے
اندر سے چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔

"دیکھو پلیز یوں مت روؤ۔" میں نے بہت کمزور
سی آواز میں اسے چپ کروانا چاہا۔ راہ چلتے کچھ لوگ
اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ میں نے اسے بازو
سے تھام کر اٹھایا۔

"باجی---- آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ میری مدد کریں
آپ کسی امیر گھرانے کی لگتی ہیں۔ مجھے صرف چھت
کا آسرا دے دیں۔ میں ساری عمر آپ کی خدمت [illegible]
گزاروں کی پاؤں دھو دھو کر پیوں گی آپ کے [illegible]
چھوٹا سا بچہ رل جائے گا جی خدا آپ کو اس [illegible]
دے گا۔" وہ بچی لہجے میں کہہ رہی تھی اور [illegible]
میں پڑ گئی تھی۔

میرے گھر میں تو پہلے ہی ملازموں کی ایک فوج [illegible]
ایسی صورت میں اس عورت کی جگہ [illegible]
تھی۔ تقریباً تمام کوارٹرز بھی زیر استعمال [illegible]
اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ میں [illegible]
کے معصوم سے چہرے پہ [illegible] اور [illegible]
سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا [illegible]
کی تکمیل کے لیے میں ایک مرتبہ پھر [illegible]
جا پہنچی تھی۔

"کوئی ایسا مسئلہ نہیں یہاں [illegible]
بندوبست کروا دیا جائے گا۔" ساری [illegible]
بعد جب عاصم نے فارمل سے انداز [illegible]
طویل سانس لے کر رہ گئی [illegible]
"لو بھئی زہرہ اب تم [illegible]
عاصم صاحب آپ کا بے [illegible]
اٹھا کر کندھے پہ ڈال دو [illegible]

"شکریہ کی کوئی بات نہیں میڈم کسی بھی بے سہارا
فرد کو سہارا دینا ہمارے مذہبی فرائض میں شامل ہے
اور خاص طور پر خواتین اور بچوں کے لیے صلہ رحمی
کے خاص احکامات نازل ہوئے ہیں۔" اس نے بڑے
شائستہ لہجے میں کہا تھا اور میں مسکرا کر اس کی بات کی
تائید میں سر ہلا کر باہر نکل آئی تھی اور ابھی میں
کوریڈور کی سیڑھیوں سے اتری ہی تھی جب اچانک
بڑا سا فٹ بال میرے کندھے پہ آ لگا تھا۔ چونکہ حملہ
بہت اچانک تھا۔ اس لیے میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے
بچی تھی۔ فطری طور پر غصے کی ایک تیز لہر میرے وجود
میں دوڑ گئی تھی۔ تب ہی اچانک کچھ بچے بھاگتے
ہوئے میرے قریب آ گئے تھے۔

"ارے آنٹی کیا یہ فٹ بال آپ کو لگا ہے؟" ایک
بچہ بے حد حیران حیران لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"پھر تو چوٹ بھی آئی ہوگی؟" دوسرے نے میرے
جواب کا انتظار کیے بغیر بڑے دکھ سے کہا تھا۔

"ہیں.... پھر تو فرسٹ ایڈ کا بندوبست کرنا چاہیے۔
جاؤ بھاگ کر کمبل لاؤ۔ آنٹی کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔"
پہلے بچے نے گھبرا کر کہا تھا۔

"بیوقوف چوٹ لگنے پہ کمبل نہیں ڈالتے، آگ
لگنے پہ ڈالتے ہیں۔" دوسرے بچے نے پیشانی پہ ہاتھ
مار کر اس کی کم عقلی پہ ماتم کیا تھا۔ جبکہ میں ان کی بات
سن کر بے ساختہ ہی ہنس دی تھی۔

"آنٹی چوٹ لگنے پر تو روتے ہیں اور آپ ہنس رہی
ہیں۔" اس بچے کی معنی خیز بات پر میں ہنستے ہنستے ایک
دم چپ ہو گئی تھی۔

"ہاں" مگر میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔
"ہم اپنی بے بسی پر ہنستے ہیں۔"
"کیا آپ ہماری نئی ٹیچر ہیں۔"
"نہیں میں تو بس آج ہی آئی ہوں۔"
"[illegible] کیوں نہیں آئیں۔"

"بچو ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ اتنی سردی میں کھیلنا
کیا؟" میں نے ان کے بے تکے سوالوں
[illegible] ہوئے ان کے سرخ سرخ چہروں کو

"ابھی تو اسٹڈی آور ختم ہوئے ہیں۔ بس تھوڑا سا
کھیلیں گے پھر میوزک کی کلاس شروع ہو جائے
گی۔"

"اچھا یہ تو بتائیں آپ کا نام کیا ہے؟" میں قریبی بنچ
پر بیٹھ گئی تھی۔

"مالیکیول۔" پہلا بچہ ابھی بولا بھی نہیں تھا کہ
دوسرے نے جھٹ سے جواب دیا تھا۔

"جی نہیں میرا نام شاویز ہے۔"

"اور میرا نام فاران۔" دوسرے بچے نے فٹ بال
زمین پر اچھالتے ہوئے کہا۔

"آنٹی آپ کا نام کیا ہے؟" شاویز خاصا سمجھدار بچہ
تھا۔

"میرا نام تو شانزے ہے مگر آپ مجھے شان کہہ سکتے
ہیں میرے پاپا مجھے شان کہا کرتے تھے۔"

"شان ہاؤ کیوٹ نیم۔" فاران نے آنکھیں میچ کر
کہا۔

"میرے پاپا بھی مجھے فانی کہتے ہیں۔"

"پاپا----" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیونکہ
میری انفارمیشن کے مطابق یہاں یتیم بچوں کی پرورش
کی جاتی تھی۔

"فانی---- آپ کے پاپا ہیں؟" میں نے قدرے
جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"جی بالکل۔" فانی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"شان آپ ملی نہیں آنٹی پاپا سے۔" شاویز یوں
متعجب تھا جیسے میں کسی بہت بڑی شخصیت سے ملنے
سے محروم رہ گئی ہوں۔

"اوہ۔" بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس
ادارے کا سرپرست ہونے کے باعث یقیناً "وہ" بچوں
کے باپ کی سی حیثیت ہی رکھتا تھا۔ ابھی میں شاویز کو
کوئی جواب بھی نہ دے پائی تھی جب کہیں دور سے
بہت پیاری نقرئی سی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز سنائی
دی۔ وہ دونوں ایک دم چونک گئے تھے۔

"میوزک پیریڈ شروع ہو گیا۔ اب ہم چلتے ہیں۔"
انہوں نے اپنے ننھے منے ہاتھ میری طرف بڑھا
دیے۔

"اوکے اللہ حافظ۔" میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"شان آپ بہت اچھی ہیں۔" چند قدم چلنے کے بعد فانی میری طرف پلٹا تھا۔
"آپ دوبارہ آئیں گی ناں؟" شازیہ کی آنکھوں میں امید کی کرن تھی۔
"اور کیا بچوں سے بڑھ کر کوئی حسین چیز ہو گی اس دنیا میں۔" معلوم نہیں وہ بچے واقعی اتنے خوب صورت تھے یا مجھے محسوس ہو رہے تھے۔
"ہاں ضرور آؤں گی۔" میں نے آگے بڑھ کر ان کے نرم گالوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا تو ان کی محبت کا لمس جیسے پورے جسم کو گرما گیا تھا۔
"تھینک یو بائے۔" وہ دونوں ہاتھ ہلا کر بھاگ گئے تھے اور میں نے بھی واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

کروٹ بدل کر میں نے مندی مندی آنکھوں سے ٹائم دیکھا۔ پونے ایک بج رہے تھے۔ گہری اور طویل پرسکون نیند لے کر میرے اعصاب کافی سکون محسوس کر رہے تھے۔ کچھ دیر یوں ہی لیٹے رہنے کے بعد میں نے تمام اہل کلب میں جھڑے اور بیڈ سے اتر آئی۔ میری ہدایت کے پیش نظر کسی نے بھی مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر خشک کرنے کے بعد جب میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا تو ایک دم جھرجھری لے کر رہ گئی۔ شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے میں سیڑھیاں اتر کر کچن میں آ گئی تھی۔
یونیورسٹی سے واپسی پر میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اسی لیے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے فریج کا جائزہ لے کر بریانی نکال کر گرم ہونے کے لیے اوون میں رکھی اور خود چائے بنانے لگی۔
"میرے لیے کافی ود آؤٹ شوگر اینڈ کریم۔" ایک مانوس سی پکار لاؤنج سے سفر کرتی مجھ تک پہنچی تھی۔ میری نگاہیں بے اختیار ہی بھٹکتی ہوئی لاؤنج میں جا پہنچی تھیں۔ متلاشی و متجسس نگاہیں کسی کو ڈھونڈتی کھوجتی ہوئیں۔ مگر اسی پل تمام تر بے قراری دے

چینی کو اپنے اندر سمو کر واپس پلٹ آئی تھیں۔
"کمال ہے بابا منوں مٹی تلے جا سوئے آپ لیکن ابھی بھی یوں لگتا ہے ہر قدم پر آپ میرے ساتھ ہیں۔ میں یہاں چائے بنا رہی ہوں اور آپ لاؤنج میں کافی کے منتظر بیٹھے ہیں۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے اور ابھی جب میں بیڈ روم واپس جا رہی ہوں گی تو آپ اپنے اسٹڈی روم سے نکل کر اچانک ہی میرے سامنے آ جائیں گے۔
"شب بخیر بابا کی جان۔" آپ کی دھیمی سی آواز چاروں طرف پھیلی خاموشی میں نازک سا ارتعاش پیدا کر دے گی اور آپ کے وجود کی نرم گرم خوشبو [illegible] تک مجھے اپنی آغوش میں لے کر تھپکتی رہے گی۔ مگر [illegible] بھی بابا ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود [illegible] احساس تسلسل مجھے ڈستا رہتا ہے کہ آپ کہیں نہیں ہیں نہ اپنے اسٹڈی روم میں، نہ لاؤنج میں نہ بیڈ روم میں اور نہ ہی کہیں اور۔" کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے ذرا سی چائے میرے ہاتھ پر گری تو میں [illegible] ہی خیالات کے جنگل سے آزاد ہوئی۔
بے اختیار ہی ہاتھ کھینچ کر میں نے جائزہ لیا [illegible] زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ لعنت [illegible] ہاتھ دھو کر میں چائے کا کپ اٹھائے ٹی وی لاؤنج [illegible] گئی۔ بار بار چینل بدلنے کے باوجود کوئی [illegible] نظر نہ آیا تو میں نے جھنجلا کر ریموٹ [illegible] پر لڑھکا دیا۔ بے وقت سونے کی [illegible] ہوئے میں ابھی یہ سوچ ہی رہی [illegible] وقت کن کاموں میں صرف کیا جا [illegible] میرے بالکل نزدیک ہلکا سا کھٹکا [illegible] آواز میرے لیے اتنی غیر متوقع تھی [illegible] خوف سے کانپ کر رہ گئی تھی۔
"اوہ تم شائد ڈر گئیں [illegible] لیکن میں تو کوریڈور کی [illegible] میرا خیال تھا قدموں کی [illegible] اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کوئی [illegible] احمد نے دائیں طرف صوفے [illegible] انہیں دیکھ کر غصے اور ناگواری [illegible]

اٹھی اور چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ غالباً اسی لیے انہوں نے اتنی وضاحت کی تھی۔ میں نے بھی چائے سمیت کپ میز پر پٹخا اور چپل پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ احتشام احمد کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت سی نمودار ہوئی۔
"شازیہ میں رات کے ڈیڑھ بجے یہاں ٹی وی پروگرام دیکھنے نہیں آیا۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"
"میں نے آپ سے یہاں آنے کی وجہ نہیں پوچھی اور یوں بھی میں اس وقت فارغ نہیں ہوں۔" میں بے اعتنائی سے کہہ کر پلٹی۔
"شازیہ پلیز۔" انہوں نے بہت اصرار کے ساتھ پکارا تھا۔
"جب بھی کوئی مخلص پیچھے سے آواز دے تو پلٹ کر ایک مرتبہ ضرور دیکھ لینا چاہیے۔" بابا نے ایک مرتبہ مجھے کہا تھا اور اس وقت یہی بات مجھے اگلا قدم اٹھانے سے روک گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ [illegible] امید سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے دوبارہ بیٹھتے دیکھ کر انہوں نے جیسے اطمینان کا سانس لیا تھا۔
"جو کہنا ہے جلدی کہیے۔" [illegible] انہوں نے کچھ دیر کے لیے ٹی وی اسکرین کو [illegible] اور پھر مجھے وہ غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ بات [illegible] شروع کی جائے۔
"[illegible] معلوم ہے جب فصیحہ نے مجھے [illegible] متعلق پہلی بار بتایا تھا تو میرے ذہن میں ایک [illegible] صورت سا تصور ابھرا تھا۔ میں نے سوچا تھا [illegible] پیاری سی گڑیا کا نام ہے جو کومل سی کانچ [illegible] جذبات کی مالک روپہلی چاندنی کی طرح [illegible] سورج کی اولین کرنوں کی طرح شوخ و شریر [illegible] بیٹیاں تو ایسی ہی ہوتی ہیں ناں؟" [illegible] سے تائید چاہی تھی۔ میں چپ [illegible] رہی۔
"[illegible] گڑیا اپنے بابا کی جدائی کے [illegible] رہ گئی ہو گی میں نے ہزار طریقے [illegible] نے کے میرا خیال تھا میں اسے بے انتہا محبت اور بے تحاشا شفقت بھری چاہت دوں گا کہ وہ ایک پھر سے کھل اٹھے گی مگر۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکے تھے اور میں نے بمشکل خود کو ٹھٹکے سے باز رکھا تھا اور اسی لیے مجھے معلوم ہوا تھا کہ کسی انتہائی ناپسندیدہ ہستی کو مسلسل سننا کس قدر ناقابل برداشت ہوتا ہے۔
"میں نے جہاں جہاں بھی تمہاری زندگی کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ وہاں وہاں تمہاری گریز تمہاری نفرت میری راہ روکتی چلی گئی۔ کتنے مہینے گزر گئے مجھے یہاں آئے ہوئے مگر تمہارے رویئے میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فصیحہ کا خیال ہے کہ میں تمہاری بلا جواز نفرت کا شکار ہو رہا ہوں۔ لیکن میں اسے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ میرے خیال میں محبت تو بلا جواز کی جا سکتی ہے مگر نفرت نہیں اور اگر تم میرے ساتھ نفرت کرتی ہو تو اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔"
مجھے اپنے وجود میں گرم گرم سی لہریں اس شدید سردی کے باوجود بھی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے اس شخص پر بے حد غصہ آ رہا تھا جو خوامخواہ خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔
"میں جانتا ہوں بیٹیاں ماں کی نسبت باپ سے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں۔ انہیں زیادہ چاہتی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں شازیہ کہ تم مجھے اپنے پاپا کی جگہ اس گھر میں قبول نہیں کر پا رہیں۔ اگر ایسا ہے تو تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہو میں صرف فصیحہ کے کہنے پر یہاں سکونت اختیار کیے ہوئے ہوں لیکن اگر تم ڈسٹرب ہوتی ہو تو میں اپنے گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا۔ لیکن تم اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں زبردستی تمہارے پاپا کی جگہ پر قبضہ جما رہا ہوں۔
میرے ذہن میں تمہارے رویئے کی یہ ایک بہت بڑی وجہ ہے لیکن اور بہت سی باتوں کو بھی میں نظر انداز نہیں کر رہا ہو سکتا ہے تم مجھے کوئی لالچی انسان سمجھ رہی ہو جو تمہارے خیال میں محض دولت، جائیداد کے حصول کے لیے اس گھر میں قدم جما رہا ہو۔"

...ریہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجھ سے شادی کرتے
...نے تمہیں اعتماد میں نہ لیا ہو یا پھر اس
...کے علاوہ بھی کوئی ایسی وجہ جس سے ہو سکتا ہے میں
...قف نہ ہوں۔" ان کی نظریں مجھے اندر تک کھوج
...ہی تھیں۔

اب میرے لیے خاموش رہنا ناممکن تھا۔ اس لیے
بے حد سرد مہری سے میں ان سے مخاطب ہوئی تھی۔
"وہ پہلی بات تو یہ ہے مسٹر احتشام احمد کہ پاپا کی جگہ
اس گھر میں نہیں میرے دل میں ہے اور اس دل سے
انہیں کوئی ہٹا سکتا ہے اور نہ زبردستی ان کی جگہ لے
سکتا ہے باقی رہ گئی دولت اور جائیداد تو اس سلسلے میں
مجھے کسی قسم کی کوئی فکر ہے نہ کسی سے کوئی خطرہ
کیونکہ میری مما کو اس دنیا میں دو ہی چیزوں سے محبت
ہے اور وہ ہے دولت اور آزادی اور ان دونوں چیزوں
کی حفاظت کرنا وہ خوب جانتی ہیں۔ اور آخری بات
ہے احتشام صاحب کہ میں محبت بھی ٹوٹ کر کرتی
ہوں اور نفرت بھی میری نفرت کا جواز اتنا معمولی ہرگز
نہیں ہو سکتا جتنا آپ کہہ رہے ہیں اور میرا خیال ہے
آپ اتنے معصوم اور انجان ہرگز نہیں جتنا خود کو ظاہر
کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں زہر خند لہجے میں
ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی اور پھر ایک جھٹکے
سے اٹھ کر ان کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ ان کی
پیشانی پر لکیروں کا جال سا بن گیا تھا اور ان کی الجھی
الجھی نگاہوں نے اس وقت تک میرا پیچھا کیا تھا جب
تک میں اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے گم نہیں
ہو گئی تھی۔

"اور میں کیسے مان لوں احتشام احمد کہ اس سارے
کھیل میں تمہارا کوئی حصہ نہیں تھا۔"
میں نے کمرے کی کھڑکی کو کھول کر سرد ہوا کو جی بھر
کے کمرے میں داخل ہونے دیا۔ لمبے لمبے سانس لے
کر میں نے اپنے اندر کی ساری گھٹن باہر نکال دینی
[illegible] دونوں
[illegible] تھام لیا اور پھر میں
[illegible] کو نارمل کرتے ہوئے

سرد ہوا میرے جسم سے ٹکرا کر پلٹتی رہی اور وقت
گزرنے کا احساس اس وقت ہوا جب میرا پورا جسم
سردی سے کپکپا رہا تھا۔ میں نے بہت آہستگی سے
اپنے جامد اعضاء کو حرکت دی اور سیدھی ہو کر کھڑکی
کے پٹ سے ٹیک لگا دی۔ آسمان کے سینے پر روشن
پورا چاند سست روی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ کھڑکی
سے ذرا آگے میرے بیڈ پر رکھے وائٹ بیم کی بتیاں چاندی
کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے گردن گھما کر بیڈ کی
سائیڈ ٹیبل پر رکھی پاپا کی خوب صورت سی تصویر کو
دیکھا اور پھر قریب آ کر تصویر کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا
لیا۔
"پاپا۔ میں تو صرف آپ کی بیٹی ہوں ناں۔
صرف آپ کی۔" میں نے جیسے سرگوشی میں انہیں
مخاطب کیا تھا۔
"اور اس شخص کو یہ گمان بھی کیسے گزرا پاپا کہ وہ
آپ کی جگہ لے سکتا ہے۔" میں نے اپنے سرد پوروں
سے تصویر کو چھونے کی کوشش کی۔
"کبھی نہیں۔ کبھی نہیں پاپا۔ وہ شخص [illegible]
جنم لے لے۔ تب بھی وہ آپ کی جگہ نہیں لے
سکتا۔" میں تصویر پر اپنا چہرہ ٹکا کر سسک اٹھی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں مسلسل [illegible]
قدموں کا طواف کر رہی تھیں اس کے [illegible]
کی گرد میں اٹے ہوئے تھے بے تحاشا [illegible]
کے جسم میں خون کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی [illegible]
"میں کون ہوں؟"
"کہاں سے آیا ہوں۔"
"مجھے کہاں جانا ہے؟"
اس نے زیر لب پوچھا تھا۔ [illegible]
ڈوبتے پرندوں اور دور تک [illegible]
گئے
مگر جواب میں ایک سناٹا [illegible]
کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ اس نے [illegible]
کر سوچا۔
"کتنے سال بیت گئے [illegible]

حالت سفر میں ہوں مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو لگتا ہے ابھی
قدم بھر مسافت بھی طے نہیں ہوئی۔ میرے پاؤں
اپنی جگہ ساکت ہیں سفر کے آغاز سے لے کر آج تک
صرف زمانے بدلے ہیں راستہ اور مقام وہی ہے میں
بھی وہیں کھڑا ہوں جہاں سے چلا تھا۔ ہاں مگر زمین
گردش میں ہے۔"
اس نے سر اٹھا کر رنگ بدلتے آسمان کو دیکھا۔
"جب میں نے سفر کا آغاز کیا تھا تو ہر چیز جیسے اپنے
نقطۂ آغاز پر تھی اور اب دن اپنی تمام تر مسافت کو
سمیٹے رات کی آغوش میں پناہ لینے جا رہا ہے شاہ خاور
اپنی نیم خوابیدہ کرنوں کو لے کر کسی دور دیس میں جا
اترے گا۔
پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کی سمت محو
پرواز ہیں منزل کو چھو لینے کی جستجو میں ان کے نازک پر
مخالف ہوا کو کاٹتے چلے جا رہے ہیں۔
اور میں جب منزل کو کھوجنے کی کوشش کرتا ہوں تو
آنکھوں میں دھند اتر آتی ہے۔ وہ طویل لامتناہی مل
[illegible] سڑک بھی کہیں راہ میں کھو سی گئی ہے۔" اس
نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا اسے لگا وہ بہت دیر
سے ایک ہی جگہ کھڑا ہے اس کے ساتھ ساتھ چلنے
والے درخت بھی اس کے ساتھ ٹھہر گئے تھے
اس کے قدموں تلے گردش کرتی زمین بھی تھم گئی

[illegible] صبح افق کی بجائے اس کی آنکھوں میں ڈوبا
[illegible] آسمان تاریکی میں مدغم ہوتا جا رہا تھا۔
[illegible] قدموں میں ارتعاش پیدا ہونے لگا۔
"[illegible] ٹھہرنا بھی نصیب نہیں۔" اس نے بے
[illegible] الٹائے زمین ایک مرتبہ پھر گردش میں

[illegible] شکستہ قدموں تلے زمین بے بھی
[illegible] نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں
[illegible] تھا۔ اس کے چاروں طرف فضا
[illegible] متحرک تھے رات کی یخ دہلیز پہ
[illegible] رہا تھا۔ اس نے شدت سے
[illegible] کی اور اس کے دل میں بکھری

تنہائی نے کسی خواب کے لمحوں سے آزاد ہو کر اس
کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

ہم بے نشان لوگوں کو
راستہ نہیں ملتا
راستہ جو مل جائے
منزلیں نہیں ملتیں
منزلیں جو مل جائیں
خود کو مل نہیں پاتے
خود کو مل نہیں پاتے

اس کی تنہائی اسے بہلا رہی تھی۔ اور اس کی
آنکھوں میں ایک سمندر جاگ رہا تھا۔
"میں تو آج تک خود سے نہیں مل سکا۔ خدا
جانے میں ہوں بھی یا نہیں۔" اس نے زور سے
آنکھیں بند کر لیں اور رات کے رخسار نم ہوتے چلے
گئے تھے۔ دور کہیں روشنیاں سی جگمگاتی محسوس ہو
رہی تھیں۔
"شاید بستی نزدیک ہے۔" اس نے خود کلامی کی
تھی۔
"صاحب۔ آپ آ گئے ہیں؟" گلزار خان کی آواز
کہیں قریب سے ابھری تھی۔
اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بلند و بانگ سیاہ آہنی
گیٹ اس کے عین سامنے تھا اور اس کے پار ایک دنیا
اس کی منتظر۔
"صاحب گاڑی کدھر ہے؟ آپ پیدل کیوں آئے
ہیں؟" گلزار خان کا متفکر چہرہ دیکھ کر اس کے چہرے پہ
مسکراہٹ لہرائی تھی۔
"گاڑی خراب ہو گئی تھی خان۔" اس نے کہتے
ہوئے سیاہ گیٹ عبور کیا۔
"قدسی بابا کب آئیں گے؟"
"وہ کھلونے لے کر آئیں گے ناں؟"
"وہ ہمیں سیر کے لیے بھی لے کر جائیں گے۔"
"وہ آ کیوں نہیں جاتے؟" زندگی سے بھرپور
آوازیں رات کے معصوم سناٹے پر کندہ ہو رہی تھیں
اور اس کے وجود پر بھی تھکن زدہ تنہائی لمحہ بھر میں چھا
گئی تھی۔ اس نے خالی ہتھیلیاں اپنے سامنے کر

لیں۔ نہ کوئی کھلونا — نہ مٹھائی — نہ تحفہ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس۔

"تقدی بابا جلدی آجائیں۔" کوئی محبت آمیز بے قرار سی دعا سنائی دی تھی۔

"اگرچہ میرے ہاتھ خالی ہیں مگر انہیں دینے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔" اس نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔

◆ ◆ ◆ ◆

میں نے تھک کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔ میرے سامنے ٹیبل پر کتابوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ جو وندیزہ جاتے ہوئے چھوڑ گئی تھی۔ آج اس نے اسائنمنٹ تیار کرنے کے لیے پوری لائبریری خالی کر ڈالی تھی مگر واپسی پر حماد اسے پک کرنے چلا آیا تھا۔ ان کے بے حد اصرار کرنے پر بھی میں نے ان کے ساتھ لنچ پر جانے سے معذرت کر لی تھی سو وندیزہ ناراضگی کے طور پر کتابوں کا یہ ڈھیر میری گود میں ڈال کر چلی گئی تھی اور اب تین گھنٹے کی مسلسل عرق ریزی کے بعد اسائنمنٹ مکمل کر کے ہی میں نے کتابوں سے سر اٹھایا تھا اور اب Rhythm of the world سنتے ہوئے میں خود کو ریلیکس کر رہی تھی۔

"بی بی جی اس میں کیا ہے؟" ملازمہ کی آواز پر میں نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دیوار گیر وارڈ روب میں کپڑوں کی ترتیب درست کر رہی تھی اور اب ایک شاپنگ بیگ ہاتھ میں پکڑے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

میں نے حیرت سے اس شاپنگ بیگ کو دیکھا۔

"اوہ" چند لمحوں بعد مجھے یاد آیا تھا۔ "دارالاطفال" سے آنے کے اگلے روز میں وندیزہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں جب وندیزہ حماد کو گفٹ دینے کے لیے کوئی "ایزی ٹو وانچ" کا بھاؤ خرید رہی تھی۔ مختلف کھلونوں کو دیکھتے ہوئے مجھے بے اختیار ہی شاویز اور فاران یاد آ گئے تھے۔ سو میں نے اپنے پرس میں موجود تمام رقم چھوٹے بڑے کھلونے خریدنے میں صرف کر دی تھی۔ خیال تھا کہ ایک دو روز میں جاؤں گی اور بچوں کو کھلونے دوں گی مگر یہ بات پھر ایسے ذہن سے نکلی تھی کہ آج ہی یاد آئی تھی۔

"اسے باہر ہی رہنے دو۔" میں ملازمہ سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وندیزہ کے اتنی جلدی آنے کی مجھے امید نہیں تھی اس لیے میں نے ابھی جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"سنو وندیزہ آئے تو اسے کہنا ابھی گھر مت جائے۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گی۔"

سر مئی کھدر کے سوٹ کی شکنیں میں نے ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے ملازمہ کو ہدایت دی اور پھر شاپنگ بیگ لے کر باہر آ گئی۔ مما کے بیڈ روم سے زور و شور سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غالباً ان کی کوئی قریبی دوست آئی ہوئی تھی جبھی تو ڈرائنگ روم کی بجائے بیڈ روم میں رونق اپنے عروج پہ تھی ان کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پہ ایک بھی نگاہ ڈالے بغیر میں آگے بڑھ گئی تھی۔

"دارالاطفال" کا پٹھان چوکیدار حسب سابق مجھے گھورنے کی بجائے نہ صرف خوش مزاجی سے مسکرایا تھا بلکہ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام بھی … دیا تھا۔

"سنو بچے اس وقت کہاں ہوں گے؟" عمارت کے دائیں طرف بنے وسیع و عریض خالی لان اور … جھولوں کو دیکھ کر میں نے چوکیدار سے پوچھا تھا۔

"ان کا تو اس وقت —" اس نے گھڑی میں … دیکھا۔

"ہاں جی ان کی اس وقت مارشل آرٹ کی … ہو رہی ہے۔"

"مارشل آرٹ کی۔" میں واقعی حیران … "تم کیا کچھ سکھاتے ہو یہاں بچوں کو …"

"بیگم صاحبہ ہم انہیں ہر وہ چیز … اکیسویں صدی کے بچوں کو سیکھنی … وقت انہیں دینی تعلیم دی جاتی ہے … ذریعے تعلیم دیتے ہیں پھر جناب ان کی … ڈرائنگ اور پھر مارشل آرٹ کی … دور تو طوطے کی طرح ایک دم شروع …

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ویسے مجھے شاویز اور فاران سے ملنا تھا۔" مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس ادارے کی ہسٹری سے بھی واقف نہ ہو سو میں نے فوراً کہہ دیا تھا۔

"ابھی بلاتے ہیں ویسے زہرہ نے کہا تھا کہ جب بھی آپ آئیں تو اس کو ضرور خبر کروں۔" مجھے ایک دم ہی اس کا خیال آیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے اسے بھی بلا دو۔" میں وہیں بنچ پر بیٹھ گئی تھی چوکیدار نے کسی ملازم کو پیغام دے کر اندر بھجوا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی زہرہ تیز تیز قدم اٹھاتی میرے پاس آ گئی تھی۔ وہ پہلے کی نسبت مطمئن لگ رہی تھی اور میرے ساتھ بیٹھ کر وہ تقریباً پندرہ منٹ تک خشوع و خضوع کے ساتھ مجھے دعاؤں سے نوازتی رہی تھی۔

"بھئی میرا تو اس میں کوئی کمال نہیں تمہیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جن کی وجہ سے تمہیں اور تمہارے بچے کو تحفظ مل گیا ہے۔" بالآخر مجھے ٹوکنا پڑا تھا۔

"ہاں جی ان کو تو جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیتی ہوں کل آئے تھے بی تقدی صاحب میں بھی ملی تھی … بہت اچھے انسان ہیں اللہ ان کی ہر مراد پوری کرے انہیں ان کی ہر نیکی کا صلہ دے۔"

"تقدی صاحب یہاں نہیں رہتے کیا؟"

"میں نے سنا ہے کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر … باہر ہی رہتے ہیں یہاں بس کچھ دنوں کے … آتے ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کا ایک پاؤں … ہے اور ایک ملک سے باہر۔" زہرہ سے … کرتے میں نے گھڑی دیکھی مجھے واپس بھی … بچوں کا دور دور تک کہیں نشان نہیں تھا … سے ذکر کیا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں خود بلا کر لاتی ہوں۔"

… دیر بعد جب میں کافی بور ہو رہی تھی … بھاگ لپکتے ہوئے میری طرف آتے … لباس میں ان تینوں بچوں کو دیکھ … ختم ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ دور آ کر رکے، جھجکے اور پھر آہستہ سے نزدیک چلے آئے۔ ان کی سانسیں بھاگنے کی وجہ سے پھول رہی تھیں اور چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

"ادھر آؤ ناں میرے پاس۔" میں نے پیار سے انہیں پکارا تو وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں آ گئے۔

"آپ بالکل بھی اچھی نہیں ہیں۔" شاویز کا لہجہ ناراضگی لیے ہوئے تھا۔

"کیوں بھئی۔" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں اور فانی ہر روز آپ کا انتظار کرتے تھے مگر آپ آئی ہی نہیں۔"

"اوہ سوری بھئی اصل میں، میں بھی پڑھتی ہوں ناں اس لیے مصروفیت میں وقت ہی نہیں نکال سکی دیکھو تو آج جیسے ہی فارغ ہوئی فوراً یہاں چلی آئی۔" میں نے دل میں پشیمان ہوتے ہوئے ان سے بہانہ کیا۔

"ویسے یہ گڑیا کون ہے؟ آپ نے تعارف ہی نہیں کروایا۔" میں نے اس گم صم سی بچی کو دیکھا جس کی سیاہ، خاموش آنکھیں اس کے دل کی حساسیت کا پتہ دیتی تھیں۔

"یہ مینی ہے میری دوست۔" شاویز نے کہا۔

"میری بھی دوست ہے۔" فانی نے جھٹ کہا۔

"جی نہیں شان یہ مینی کو تنگ کرتا ہے اس لیے اس کا دوست نہیں ہے۔" شاویز نے جھٹ انکار کر دیا تھا۔

"مینی بتائے گی کہ یہ کس کی دوست ہے کیوں مینی؟"

"دونوں دوست ہیں بس فانی میری پونی کھینچتا رہتا ہے اس لیے میں اس سے کٹی کر لیتی ہوں۔" اس نے بہت سوچ کر کہا تھا۔

"بھئی بہت بری بات ہے فانی فرینڈز کو تنگ تو نہیں کرتے ناں؟" میں نے فانی کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"سوری شان آئندہ نہیں کروں گا۔" وہ بڑے آرام سے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معذرت کرنے لگا تھا۔

"وہاں لاک اے گڈ بوائے۔ اسی خوشی پر میں آپ لوگوں کو آپ کے گفٹس دے رہی ہوں۔" میں نے کہا تو ان کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھی تھیں۔

"شان اس میں کیا ہے؟" فائی نے باقی گفٹس دیکھے۔

"یہ آپ کے دوسرے فرینڈز کے لیے ہیں اس کے علاوہ چاکلیٹس اور سویٹس بھی ہیں وہ زہرہ آپ سب میں تقسیم کردے گی ٹھیک؟"

"نہیں" "نہیں وہ بالکل بھی اچھی نہیں ہے اس کو نہیں دینے۔" شاویز نے پاؤں پٹخے۔

"کیوں بھئی۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جب مجھے نہلاتی ہے ناں تو گدگدی بہت کرتی ہے۔" اس کے کہنے پر میں بے ساختہ ہنس دی تھی۔

"اچھا تو زہرہ تمہیں نہلاتی ہے کیوں زہرہ تمہیں شاویز کے گدگدی نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے خاموش بیٹھی زہرہ سے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"بس باجی بی میرا دل چاہتا ہے۔ یہ بچے ہر وقت ہنستے کھیلتے رہیں اس لیے کبھی کبھار چھیڑتی رہتی ہوں میرا بس نہیں چلتا باجی ورنہ میں سب بچوں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں اپنی گود میں لے کر لوریاں سناؤں اپنی ساری محبت ان بچوں پر لٹا دوں۔" میں نے حیرت سے دیکھا زہرہ کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبتوں کا ایک جہان آباد تھا۔ ماں کا ایسا روپ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ نجانے کیوں مجھے ایک دم کسی کمی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے میں اب چلتی ہوں۔" میں بولی تو میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"شان۔۔۔ آپ پھر کب آئیں گی۔" عینی نے میرا ہاتھ پکڑ کر سوال کیا تھا۔

"معلوم نہیں۔" میں نے ایمانداری سے جواب دیا۔

"ہم کل آپ کا انتظار کریں گے۔" شاویز نے کہا تھا اور باقی دونوں نے سرہلا کر اس کی تائید کی نے ان کے جذبات کو محسوس کر کے اثبات میں دیا اور جب میں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو تینوں مجھے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"وجہ کچھ نہیں بس اسے بھی اپنے باپ کی طرح موقع چاہیے مجھے ستانے کا۔" مما ونیزہ سے میری ہی شکایت کر رہی تھیں۔ میں پردہ ہٹا کر میں داخل ہوئی تو وہ دونوں میری طرف متوجہ ہو گئیں میں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"دیکھ لیا تم نے کتنی بد تہذیب ہوتی جارہی ہے گھر میں آکر "ہیلو" تک کہنا گوارا نہیں اسے اور اس کا حلیہ دیکھو ذرا ایک سے ایک قیمتی سوٹ ہے اس کی وارڈ روب میں مگر مجال ہے کبھی جو یہ ڈھنگ کا لباس پہن لے آخر کیا سوچتے ہوں گے لوگ اسے دیکھ کر۔" مما میری بے نیازی پر غصے سے کھول اٹھی تھیں۔ ونیزہ بے چاری خود کو مجرم سمجھتے ہوئے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں خود کو پلٹنے سے روک نہیں سکی تھی۔

"ونیزہ انہیں بتا دو کہ جن لوگوں سے میں مل کر آرہی ہوں وہ ظاہر سے نہیں باطن سے مرعوب ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ قیمتی ملبوسات اور امپورٹڈ جیولری کسی کی عزت و توقیر میں اضافے کا باعث نہیں بنتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج انتہائی کمتر لباس میں ایک ان پڑھ عورت مجھے اپنی ماں کے مقابلے میں ہزار درجے بہتر نظر نہ آتی۔"

میں مما کے تمتماتے چہرے اور ونیزہ کی بے حد حیرت کو نظر انداز کر کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی اور قبل اس کے کہ ونیزہ آکر مجھے سمجھانے کا فریضہ سرانجام دیتی میں اسٹیریو پر wory we do it The کا فل والیوم میں چلا کر اپنے بیڈ پر گر گئی تھی مگر اس سے پہلے میں دروازہ لاک کرنا اور کانوں پر تکیہ رکھنا نہیں بھولی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"وہ جی بڑی بیگم صاحبہ نے آپ کے لیے پیغام دیا

ونیزہ بی بی اور ان کے منگیتر کے گھر ہی ہے۔ اس لیے آپ گھر پر ہی شاور لے کر باتھ روم سے باہر آئی ہی لے کر آدھمکی۔

"پیغام چند گھنٹے پہلے تک تو ایسا کوئی پروگرام نہیں آیا تھا۔"

"معلوم نہیں جی انہوں نے پیغام دیا تھا میں نے پہنچا دیا خانساماں کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بنانا ہو بتا دیں۔"

"اف ایک تو مما کو وقت بے وقت دعوت سوجھتی ہے اور اس پر ملازمین کو ہدایات تک دینا گوارا نہیں۔" میں نے گیلا تولیہ بیڈ پر پٹخا تھا۔

"مما خود کہاں ہیں؟"

"وہ تو شمیم صاحب کے ساتھ کسی دعوت پر گئی ہیں۔" اس کے جواب نے مجھے اچھا خاصا تپا کر رکھ دیا تھا۔

"آخر ضرورت ہی کیا تھی یہ کھڑاک ڈالنے کی۔۔۔ اچھا تم چلو میں خود آکر بتاتی ہوں۔" رضیہ کو ٹال کر میں فون کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں بھئی ونیزہ بی بی یہ دعوت کا کیا چکر ہے۔" میں نے فون ملتے ہی اس سے پوچھا۔

"کوئی چکر وکر نہیں فصیحہ آنٹی نے کہا میں تم لوگوں کی دعوت کرنا چاہتی ہوں میں نے کہا کریں یوں بھی حماد ایک دو دنوں میں بزنس ٹور پر جارہے ہیں اس لیے میں نے سوچا یہی وقت مناسب ہے۔" وہ مزے سے کہہ رہی تھی۔

"جی ہاں آپ کی آنٹی صاحبہ خود تو دعوت اڑانے چلی گئی ہیں اور مصیبت ساری میرے لیے۔۔۔ خیر اب بتاؤ کیا بنواؤں تمہارے ہونے والے کے لیے۔" میں اصل مقصد کی طرف آئی۔

"ہاں یہ پوچھی ہے ناں کام کی بات ہم چار کو ذرا میں سوچ کر بتاتی ہوں۔" دوسری طرف ایک طویل خاموشی چھا گئی تھی۔

"سوچ رہی ہو یا مراقبے میں چلی گئی ہو اب بتا بھی چکو۔" میں نے اکتا کر کہا۔

"اچھا پھر یوں کرو پہلے فش بنوا لو سویٹ اینڈ سار ساس کے ساتھ اور لیمن چکن ہو جائے گا اس کے علاوہ اسپائسی کنگ پران وو ویجیٹیبل رائس اور سبزی کوئی سی بھی بنوا لینا میٹھے میں رس بھری چھوڑا اور اس کے علاوہ اگر تم کوئی اضافہ کرنا چاہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"باتیں تم میرے پاس ہوتیں تو یقیناً ڈائننگ ٹیبل تک یونی کا بھی اضافہ ہو جاتا بہت شوق سے تناول فرماتے تمہارے حماد صاحب۔" میں نے دانت کچکچائے۔

"اچھا۔۔۔ اچھا سنو ذرا۔" اس نے ہنستے ہوئے مجھے کہا۔

"دیکھو ذرا دھیان سے حماد کے گھر والے بھی ہوں گے اس لیے پلیز تم۔" اس نے سنجیدگی سے کہنا چاہا۔

"دیٹس ناٹ ویری ڈیل۔" "مجھے معلوم تھا وہ کیا کہنے جارہی تھی اس لیے میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

میں نے خانساماں کو ہدایت دے کر ڈائننگ روم کی از سر نو ڈیکوریشن کروائی۔ تازہ پھولوں کا گلدستہ خود بنا کر ٹیبل پر رکھا اور پھر مووی لگا کر بیٹھی تو اسی وقت اٹھی جب سب مہمانوں نے ایک دم دھاوا بول دیا۔ پھر باتوں کے دوران جب کھانا لگنے کی اطلاع دی گئی تو سب کا رخ ڈائننگ روم کی طرف ہو گیا ونیزہ سے باتیں کرتے ہوئے جب میں نے اپنی مخصوص کرسی سنبھالی تو نظریں خود بخود سامنے رکھی کرسی پر جا پڑی تھیں اس کرسی پر ہمیشہ پاپا بیٹھا کرتے تھے اور جب بھی کوئی فرد ان کی جگہ بیٹھ جاتا تو میں چھریاں کانٹے پٹخ کر ناراض ہو جایا کرتی کہ ہرگز نہیں یہاں پاپا بیٹھیں گے۔ اور اب۔۔۔ اب بھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ایک مرتبہ پھر ناراض ہو جاؤں اور یہ کرسی فوراً خالی کر دی جائے اور اگر مجھے ذرا بھی امید ہوتی کہ کرسی خالی ہوتے ہی ہنستے مسکراتے پاپا اس پر آ بیٹھیں گے تو میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہ کرتی۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" ہشاش بشاش جاندار آو

نے بھی کونو ٹکا دیا تھا۔
"تو ایک اسی کی کمی رہ گئی تھی۔" میں نے جھنجلا کر نیچے پلیٹ میں پٹخا ٹکڑا اگلے ہی لمحے اسے دوبارہ اٹھا لیا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس لمحے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔
"تو بھئی کب سے تمہارا انتظار تھا۔" حماد پرتپاک انداز میں اس سے ملا تھا۔
"رئیلی؟" ولید احتشام جیسے خوشگوار حیرت کا شکار ہوا تھا۔
"اچھا اچھا بھئی بیٹھو اب کھانا شروع کرو۔" احتشام احمد کے کہنے پر ولید میرے برابر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ نجانے کیوں کھانے میں نمک ایک دم بہت تیز ہو گیا تھا۔ میں نے چمچہ رکھ کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ونیزہ بے چاری گاہے گاہے مجھے دیکھ رہی تھی کہ میں کسی بات پر میں واک آؤٹ نہ کر جاؤں۔
"پلیز یہ ڈش پکڑائیے گا۔" ولید احتشام نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور مجھ سے پہلے ہی ونیزہ نے فوراً ڈش اس کی طرف بڑھا دی تھی۔
"تھینک یو۔" دھیرے سے کہا گیا تھا۔
"تم ٹھیک طرح سے کھا نہیں رہیں۔" اس نے اچانک ہی گردن موڑ کر بہت اپنائیت سے پوچھا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا کچھ لوگ آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے اور کچھ مکمل طور پر کھانے کی طرف۔
"اگر میں نہیں کھا رہی تو اس سے آپ کو کیا تکلیف پہنچ رہی ہے۔" میں نے یونہی چاولوں سے کھیلتے ہوئے بہت نارمل انداز میں اس سے کہا تھا اور دل کو بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ جہاں اور بہت سے لوگوں کو برداشت کر رہی ہو وہاں ایک اور کو بھی بھگت لو۔
میرے جواب پر ولید کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری تھی اس کا اندازہ مجھے اس کی طرف دیکھے بغیر ہو رہا تھا۔
کھانے کے بعد باقی لوگ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے جبکہ ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں آ گئے تھے۔
"ویسے شانزے آپ بہت کم بولتی ہیں [illegible]" صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔
"جی ہاں۔۔ کم بولتی ہیں مگر جب بھی [illegible] خوب بولتی ہیں۔" وہ غالباً طنز کر رہا تھا۔ میں [illegible] ہی دل میں جتنی گالیاں ازبر تھیں اسے دے [illegible] اگر ونیزہ اور حماد کا خیال نہ ہوتا تو لمحہ بھر میں اس [illegible] سے قفس کو اس کی اوقات یاد دلا دیتی اور [illegible] جب سب لوگ واپسی کے ارادے سے اٹھے [illegible] دل و دماغ پر بے حد بوجھ تھا اور اعصاب [illegible] احساسات کو ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال [illegible] تھے۔
اور جب انہیں رخصت کرنے کے ارادے سے میں سب لوگوں کے ساتھ باہر آئی تو چاند تو سب سے زیادہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا اور سوئمنگ [illegible] خرام ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی اس لمحے شدت سے میرا دل چاہا تھا کہ میرے ارد گرد چپکے یہ لوگ ایکدم اس منظر سے ہٹ جائیں اور میں تنہا اس ماحول میں خود سے باتیں کروں۔ ونیزہ وغیرہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ حماد، مما اور احتشام احمد کے سامنے کھڑا الوداعی کلمات کہہ رہا تھا اور مما اپنے ہنستے مسکراتے فریش چہرے کے ساتھ اس سے نجانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں ان سے قدرے فاصلے پر کھڑی آسمان کے آخری کنارے پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔

ہم ان کے دیکھنے کو بجھتے ہیں زندگی
ان کا یہ حال ہے کہ ادھر دیکھتے نہیں

ولید احتشام کی گمبیر آواز کہیں بہت قریب سے ابھری تھی۔ میں نے چونک کر گردن گھمائی وہ عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔
"اپنا خیال رکھنا۔" نظریں ملتے ہی اس نے ہمیشہ کی طرح بہت نرمی سے کہا تھا اور پھر میرے قریب سے گزر کر مما کے پاس چلا گیا تھا۔ میں اس کے انداز پر چڑ کر رہ گئی تھی۔
"ارے ولید بیٹا تم بھی مہمانوں کی طرح چلنے کے

[illegible] تمہارا تو اپنا گھر ہے چلو میں تمہارے [illegible]" مما لگاوٹ بھرے لہجے [illegible] ملاتی ہوئیں [illegible] رہی تھیں اور میں نے چپ چاپ [illegible] کی طرف بڑھا دیئے تھے۔ نجانے کیوں [illegible] دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں کسی [illegible] اجنبی لوگوں کے [illegible] میں کھڑی ہوں۔
[illegible] پاپا کی یادوں کے سوا اس گھر کی ہر [illegible] اجنبی ہو چکی ہے۔
[illegible] اپنے تاریک کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ [illegible] بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز فضا [illegible] اور پھر معدوم ہو گئی تھی۔ ولید احتشام جا چکا [illegible] باہر مکمل سناٹا تھا۔ میں آہستگی سے بیڈ پر [illegible] اور اب مجھے بہت دیر تک جاگنا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز میں "دارالاطفال" پہنچی تو نہ صرف شاویز بلکہ فانی اور بہت سے بچوں کے ساتھ نیم دائرے [illegible] تھے۔
"ان سب لوگوں کو کیا ہوا؟" میں حیرت سے [illegible] چلتے ہوئے ان کے قریب گئی اور پھر ان سب کے درمیان عینی کو بیٹھے دیکھ کر میں مزید حیران ہو گئی تھی۔ عینی کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔
"ارے کیا ہوا ہے؟" میں شولڈر بیگ گھاس پر پھینک کر فوراً اس کی طرف بڑھی مجھے دیکھ کر ہمدردی کا احساس پاتے ہوئے عینی کے آنسو بے اختیار چھلک گئے تھے۔
"شان۔۔ عینی کے کانٹا چبھ گیا ہے۔" فانی نے فوراً مجھے اطلاع دی۔
"مگر کیسے؟" میں نے اس کی چھوٹی سی انگلی پر ننھے سے خون کے قطرے کو دیکھا۔
"یہ آپ کے لیے بوکے بنا رہی تھی۔ پھول توڑتے ہوئے کانٹا ہاتھ پہ لگ گیا۔" شاویز نے جھجکتے لہجے میں مجھے بتایا۔
"میرے لیے؟" حیرت کا مقام تو تھا ناں کہ جس بچی [illegible] لمحوں کے لیے ہی سہی [illegible] سے میں صرف چند [illegible] صرف مجھے یاد رکھا تھا بلکہ تحفہ دینے کی خواہش بھی اس کے دل میں ابھری تھی۔ میں نے بے اختیار ہی اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔
"جانو۔۔ آپ کی محبت میرے لیے کم تھی کیا؟" میں نے ٹشو سے خون صاف کیا اور پھر اس کا ہاتھ چوم لیا۔
"اب آرام آ گیا ہے ناں؟" میرے پوچھنے پر عینی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔
"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ خون نکل رہا ہے کمبل اوپر ڈال دیتے ہیں۔" فانی کی بات پر میں بے اختیار ہنس دی تھی جبکہ شاویز نے اپنا سر تھام لیا تھا۔
"شان میں نے اس کو کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ آگ لگنے پر کمبل ڈالتے ہیں مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا اس روز آصف کی آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا اور اس نے بیٹھ کر بڑا کمبل اٹھا کر اس پہ ڈال دیا تھا۔" شاویز فانی کی حرکتوں سے خاصا نالاں لگ رہا تھا۔ جبکہ میرے لیے اپنے قہقہے کو کنٹرول کرنا مشکل لگ رہا تھا۔
"اچھا خیر اب اپنے باقی دوستوں سے بھی تعارف کرواؤ۔" میں نے دوسرے بچوں کی طرف اشارہ کیا تو فانی فرداً فرداً سب کا تعارف کروانے لگا تھا۔
"شان آنٹی آپ کو کرکٹ کھیلنی آتی ہے۔" ایک نسبتاً بڑے بچے نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"پھر ہو جائے مقابلہ۔" دوسرے بچے نے بڑے اشتیاق سے چٹکی بجاتے ہوئے مقابلے کی دعوت دی تو میں کچھ لمحے سوچنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاویز اور فانی جیسے ننھے منے بچوں کو ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد دو ٹیمیں بن گئی تھیں ایک وقت تھا جب میں اور ونیزہ کرکٹ کی جنون کی حد تک شوقین تھیں۔ بچپن میں واحد یہ ہی کھیل تھا جو ہم لوگوں نے بے تحاشا کھیلا تھا۔ اسی لیے جب پہلی بال بلے پر آ کر لگی تھی تو اس کے ساتھ ہی [illegible] کا شیشہ [illegible] گیا تھا اور ہنستا مسکراتا بچپن ایک دم سامنے آ کھڑا ہوا

تھا۔ اسی لیے ہر بال پر شاٹ لگاتے ہوئے اور اچھل اچھل کر آؤٹ ہونے کی اپیل مسترد کرتے ہوئے میں بھول گئی تھی کہ یہ شانزے ایمان سیونتھ کلاس کی نہیں بلکہ یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک اسٹوڈنٹ ہے۔ جوں جوں رنز بڑھتے جا رہے تھے شاویز اور فانی کے چہرے بے تحاشا خوشی سے چمک رہے تھے اور جسم کا سارا خون جیسے چہروں میں سمٹ آیا تھا۔ وہ پوری طرح مجھے سپورٹ کر رہے تھے۔

اور جب ایک زوردار شاٹ پر بال اونچی چلی گئی تھی۔ تو "سکسر" کا ایک زوردار نعرہ بھی ساتھ ہی گونجا تھا۔ مخالف ٹیم کے بچے کافی دلگرفتہ ہو کر اڑتی ہوئی گیند کو دیکھ رہے تھے اور انتہائی غیر متوقع طور پر گیند بجائے نیچے گرنے کے دو مضبوط ہاتھوں میں کیچ ہو چکی تھی۔ مخالف ٹیم کے کھلاڑی 'اس آخری کھلاڑی کے آؤٹ ہونے پر بھنگڑا ڈال رہے تھے جبکہ باقی بچے انتہائی صدمے کے عالم میں اس لمبے چوڑے شخص کو دیکھ رہے تھے جس نے عین وقت پر کیچ کر کے سارا کھیل خراب کر دیا تھا۔

اور میں کسی نامعلوم سی خجالت کا شکار ہوتے ہوئے بینچ کی طرف پلٹی تھی۔ میں نجانے کیوں اس شخص کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ جو اب بچوں کو نجانے کیا کیا ہدایات دے رہا تھا اور جب میں جرسی پہن کر، جو گرنے سے خوامخواہی کھول کر دوبارہ کس کر باندھ کر پلٹی تو وہ دونوں ہاتھ جیبوں میں گھسائے جاتے ہوئے بچوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں وہ کسی یونانی دیوتا کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک مغروری بے نیازی تھی۔

"ہیلو آفندی صاحب۔" مجھے مجبوراً اسے پکارنا [illegible] اس کی ساحر آنکھیں زاویہ بدل کر میرے چہرے [illegible]

[illegible] میں آپ؟" متبالی ہونٹوں پر مبہم سی [illegible]

[illegible]" میں نے بہت فارمل سے [illegible]

"آج سب بچے غیر معمولی طور پر خوش تھے۔ کافی عرصے بعد ان کے پاس ایک ایسا فرد آیا ہے۔ جو ان میں سے نہیں مگر ان جیسا ضرور ہے۔ مخلص، بے لوث چاہنے والا۔" میں نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ دوسروں کے بارے میں بہت جلد رائے قائم کر لیتے ہیں۔" میں نے دونوں بازو سینے پر لپیٹے سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ سردی کا احساس بڑھنے لگا تھا۔

"نہیں میں دوسروں کو بہت جلد پہچان لیتا ہوں۔" اس کا لہجہ پر یقین تھا۔ میں نے کندھے اچکا کر قدرے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"آئیے آپ کو چائے پلواتے ہیں۔" اس کی آفر پر میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے اب میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے آئے ہوئے۔" میں نے گھاس پر پڑا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ جرسی کی جیب میں گاڑی کی چابی کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے میں اسے خدا حافظ کہہ کر گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

"مس شانزے ایمان۔" میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"آتی رہا کریں۔" اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا اصرار تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گیٹ سے باہر نکل آئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے [illegible] لیے سوچا اور پھر گاڑی کا رخ [illegible] طرف کر دیا تھا۔ اگلے روز میں نے بھاری [illegible] کیش کروایا تھا اور منیجر کی زبانی مجھے معلوم [illegible] اب بھی اتنی ہی رقم ہر ماہ میرے اکاؤنٹ [illegible] کروائی جاتی ہے جتنی کہ پاپا کی زندگی میں [illegible] جاتی تھی۔ احتشام احمد کی یہ عنایت مجھ [illegible] انداز نہ ہوئی تھی ظاہر ہے یہ سارا [illegible] ہی تو تھا اور اس پر میرا حق آج بھی [illegible] کی موجودگی میں تھا اور جب [illegible] "دارالاطفال" کے فنڈ میں جمع کروائی [illegible] بڑے بھاؤ سے رقم لینے سے انکار [illegible]

"مگر کیوں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہم لوگ ادارے کے لیے فنڈز یا ڈونیشنز نہیں لیتے۔" وہ بہت اطمینان سے بتا رہا تھا۔

"کیا مطلب۔" بات اچنبھے کی تھی کہ اگر فنڈز نہیں لیے جاتے تو اتنا بڑا ادارہ اتنی کامیابی سے کیسے چل رہا تھا۔

"ان فیکٹ سب کچھ آفندی صاحب ذاتی طور پر ہی ارینج کرتے ہیں۔ آئی مین تمام تر اخراجات وہ خود افورڈ کرتے ہیں اس لیے ہمیں بیرونی امداد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہاں اگر آپ نیکی کا جذبہ رکھتی ہیں تو اس کی تسکین کے لیے اور بچوں کی مدد کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔"

"مثلاً۔" وہ رکا تو میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیں میڈم یہاں جن بچوں کو آپ خوش، مطمئن اور زندگی کی خوشیوں سے لطف کشید کرتے دیکھتی ہیں یہ بچے ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں اور نہ ہمیشہ سے یہاں رہتے آئے ہیں۔ ان بچوں کا پس منظر بہت دردناک ہے۔" عاصم نے میز پر رکھے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنساتے ہوئے کہا۔

"ان میں سے کچھ بچے ایسے ہیں جو قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہیں۔ مختلف حادثات میں جو اپنے والدین کو کھو بیٹھے ہیں کچھ ایسے ہیں کہ لوگوں کے ہجوم میں جن کے ہاتھ سے ماں کی انگلی پھسلی اور پھر وہ لمس ہمیشہ کے لیے ایک خواب بن کر رہ گیا۔ کچھ ایسے ہیں جو رات کی سیاہی کا ثمر ہیں اور کوڑے کے ڈھیر سے انسانیت کی اخلاقی قدروں پر ماتم کناں ملے۔ کچھ بچے وہ ہیں جو اپنے ہاتھ بھیک کے لیے پھیلاتے تو ان کی آنکھیں ندامت سے چور ہوتی تھیں۔ ماں باپ کی مجبوریوں کے عوض یہاں [illegible] کر ان کے گھروں میں بھوک کا ڈیرہ تھا [illegible] روٹی نگلتا ہے۔ [illegible] ان کو یہاں لانے کا مقصد نہ صرف ان [illegible] کی تکمیل بلکہ ان کی شخصیت کی [illegible] ہے۔ اس لحاظ سے ان بچوں کو اولین ضرورت روٹی، کپڑا، رہائش ہے۔ جو کہ پوری کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد جو چیز ان کے لیے ٹانک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے پیار، محبت، توجہ، شفقت، تعلیم اور پھر بہترین تربیت اور آپ جیسے ہمدرد لوگوں سے ہم انہی چیزوں کی توقع رکھتے ہیں۔ آپ انہیں فراغت میں پڑھانے کے لیے آ سکتی ہیں کوئی ایسا فن کوئی ہنر جو آپ کے خیال میں ان کے لیے بہتر ہو وہ سکھا سکتی ہیں۔ یعنی کوئی بھی ایسا کام جس سے ان کی محرومیاں دم توڑ دیں اور ایک مضبوط، پروقار، مستحکم شخصیت کی تعمیر ہو سکے۔"

عاصم نے بات مکمل کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ میں نے بھی طویل سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے عاصم میں غور کروں گی کہ میری ذات ان بچوں کے لیے کس طرح فائدہ بخش ہو سکتی ہے۔" میں تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کر چلی آئی تھی۔ درحقیقت عاصم کی گفتگو سے دل پر بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ میں جو یہاں آ کر جمشید آفندی کے اس قول پر ایمان لا رہی تھی کہ "زندگی یہاں بہت ہنستی کھلکھلاتی ملے گی" اب ایک نامعلوم دکھ کے حصار میں گھر گئی تھی۔

"تو گویا مسکراہٹ اور آنسوؤں کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسے دن اور رات کا جو نہ ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی روشن اور چمکدار دن اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ رات کے سیاہ گھور اندھیرے کو کائنات پر قابض ہونے سے روک سکے اور یوں دن، رات کی جنوں خیزی میں اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور مسکراہٹ آنسوؤں کی بارش میں گھل جاتی ہے۔"

"دارالاطفال" کی سفید عمارت اداسی کی دھند میں لپٹی نظر آ رہی تھی اور میں بوجھل دل کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ گاڑی کو ہموار سڑک پر دوڑاتے ہوئے میں نے عاصم کی باتیں ایک مرتبہ پھر ذہن میں دہرائی تھیں۔ کچھ نئے خیالات شعور کے دروازے پر دھیرے دھیرے دستک دے رہے تھے اور گھر پہنچنے تک میں "دارالاطفال" کو مستقل طور پر

جوائن کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"او بادشاہو اب کدھر کے ارادے ہیں؟" وہی مخصوص لب و لہجہ وہی کھنکتی آواز کوریڈور میں چلتے چلتے میں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو زوار شاہ ہمیشہ کی طرح اپنی بدرنگ جینز اور گھسی چپل پہنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا تھا۔ انداز میں حد درجہ بے نیازی تھی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو زوار شاہ اتنی سردی میں تم صرف چپل پہن کر پھر رہے ہو۔ بیمار پڑنے کا ارادہ ہے کیا؟ اور وہ تمہارے جوگرز کیا ہوئے جو تم نے دو سال پہلے سال بھر کی پاکٹ منی جمع کر کے لیے تھے۔" میں جرابوں، جوگرز میں جکڑے ہونے کے باوجود ٹھنڈک محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتی تھی۔

"میں بتاتا ہوں محترمہ کہ وہ جوگرز کیا ہوئے۔" معظم ہاشمی صاحب کے آفس سے ابھی ابھی نکلا تھا۔

"کل جب یہ میری بائیک پر لفٹ لے کر گھر جانے کے لیے نکلے تو راستے میں ان کو ایک ایسا شخص نظر آیا جو پاؤں سے ننگا تھا اور اپنی ریڑھی دھکیل رہا تھا۔ بس ان محترم نے میری بائیک سے جمپ لگائی حاتم طائی کی قبر پہ لات ماری اور جھٹ سے اپنے جوگرز اتار کر اس شخص کے ہاتھ میں تھمائے اور خود چل دیے ننگے پاؤں۔" معظم ایک ہی سانس میں ساری داستان سنا کر فراپ سے عاصم کے آفس میں گھس گیا تھا۔ میں نے حیرت سے زوار شاہ کو دیکھا جو اب سر کھجاتے ہوئے دائیں بائیں جھانک رہا تھا۔

"زوار شاہ ہمدردی اچھی چیز ہے مگر..."

"شانزے بی بی..." اس نے فوراً مجھے ٹوک دیا۔

"وہ شخص بہت بوڑھا تھا۔ موسم کی یہ شدت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی میرے لیے نہیں اس لیے مجھے کم از کم وہ تو کرنا چاہیے تھا ناں جو میں کر سکتا تھا۔"

"تمہیں عاصم کی بات مان لینی چاہیے۔ آخر وہ تمہارے کام کا معاوضہ دے گا خدانخواستہ کوئی بھیک یا امدادی رقم تو تمہارے ہاتھ پہ نہیں رکھے گا ناں۔"

میں جانتی تھی وہ مفلس ہونے کے باوجود رضاکارانہ طور پر کام کر رہا تھا۔

"شانزے جی اگر ہر نیکی کا صلہ یہیں مل گیا تو آخرت کے لیے کیا بچے گا۔" اس نے بہت عام سے انداز میں بہت خاص بات کہی تھی۔ پھر آفس کا دروازہ کھولتے ہوئے بایاں بازو پھیلاتے ہوئے قدرے جھک کر گویا احتراماً مجھے آفس میں داخل ہونے کے لیے کہا تھا۔ آفس میں اس وقت خوب رونق لگی ہوئی تھی۔

"آئیے آئیے مس شانزے ایمان ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" رضا نے فوراً میرے لیے کرسی خالی کی۔

"ویسے بائے داوے... ذکر خیر ہی تھا ناں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی جی بالکل... آپ کی اعلیٰ کارکردگی پر شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔ اس ایک [illegible] کے دوران آپ نے جس ذہانت سے کام [illegible] اس نے نہ صرف بچوں بلکہ "بڑوں" کو بھی گرویدہ بنا دیا ہے۔" رضا نے اپنے بال سنوارتے ہوئے "بڑوں" پر زور دیا تو میں مسکرائے بنا نہیں رہ سکی۔

"واقعی رضا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسپیشل چلڈرن کے لیے کام کرنا بہت محنت اور صبر طلب کام [illegible] طرح سے شانزے انہیں ٹریٹ کرتی ہے [illegible] ہوتا ہے جیسے اس نے باقاعدہ ٹریننگ لے [illegible]" بر بروئے کہا تو میں جھینپ کر رہ گئی۔

"کیوں مجھے شرمندہ کرنے پر تلے [illegible] میں نے تو زندگی گزارنے کا ڈھنگ بھی [illegible] سے طریقہ محبت کا ہنر تو میں نے [illegible] سیکھا ہے۔ اور اگر میں یہاں نہ آتی تو اندر [illegible] گھٹ کر سانس بھی نہ لے سکتی۔"

"وہ ہو لگتا ہے باقاعدہ شاعری [illegible] ہماری۔" زوار شاہ نے [illegible] ہوئے کہا۔

"یس سر یو آر رائٹ۔" "میں [illegible]

کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں مس شانزے ابھی سب کے لیے چائے آ رہی ہے۔" عاصم نے کہا تو میں نے ایک لمحے کے لیے سوچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں... میرا خیال ہے اب میں چلتی ہوں... ان لکٹ میں یونیورسٹی سے سیدھی ادھر آ گئی تھی... لنچ بھی نہیں کیا اس لیے اس وقت سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

"ناٹ پرابلم... ہم ابھی لنچ کا بندوبست کروائے دیتے ہیں۔" عاصم نے فوراً انٹر کام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ارے نہیں عاصم ونیزہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اس لیے بہتر ہے کہ اب میں نکل پڑوں وقت پہ نہ پہنچی تو مجھے کچا چبا جائے گی۔" میں سہولت سے اسے منع کر کے باہر نکل آئی تھی۔

"ارے ہاں عاصم۔" میں کسی خیال کے تحت پلٹی تو عاصم جو زوار شاہ کی طرف رخ موڑ چکا تھا اس بار پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"حیدری صاحب کو بہت عرصے سے نہیں دیکھا... کہاں گئے ہوئے ہیں؟"

"جی وہ سنگاپور گئے ہوئے ہیں۔" اس نے بتایا تو میں سر ہلا کر باہر نکل آئی۔

"کتنی عجیب بات ہے کہ پورا ایک ماہ ہو گیا ہے [illegible] آتے ہوئے اور ان تین دنوں میں میں ایک شخص سے نہیں مل پائی جس نے کہا تھا کہ ایک قطرہ سمندر میں جا کر اپنا وجود کھو دیتا ہے کائنات میں بکھرے بے شمار دکھوں میں [illegible] بہت حقیر نظر آئے گا۔" "اور مجھے لگتا [illegible] نے درست ہی کہا تھا کیونکہ وہ دکھ جو [illegible] میں رگ میں زہر آلود سوئیوں کی [illegible] تھا اور ہر لمحہ میری روح کو ایک نئے [illegible] رہا تھا اب محض ایک پھانس بن کر [illegible] اور مجھے تو یہ بھی لگتا ہے کہ یہ پھانس [illegible] ہوتی جا رہی ہے۔"

[illegible] راہداری سے چلتے ہوئے سوچا تھا۔

اطراف میں درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ تپش سے محروم سورج کی کرنیں پژمردگی اور بیچارگی سے اپنے وجود کو سمیٹتی ہوئی زمین سے لمحہ بہ لمحہ جدا ہوتی جا رہی تھیں عجیب سرد سی اداسی پورے ماحول میں رچی بسی تھی۔ نہ کوئی شور نہ ہنگامہ نہ آواز نہ پکار صرف میرے قدموں کی مدھم چاپ تھی جو اس لامحدود چپ پر ثبت ہو رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا بالکل یہ ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہے اداس پژمردہ خاموش اور اس خاموش بستی میں بھی کوئی مدھم سی چاپ ابھر رہی ہے خیال، سوچ، فکر کے بڑھتا قدموں کی مدھم سی چاپ اور کچھ بھی نہیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"واٹس رونگ ودیو ونیزہ کیوں تنگ کر رہی ہو؟" میں نے سخت جھنجلا کر کہا وہ کوئی پندرہ منٹ سے عین میرے سامنے صوفے پر بیٹھی نظروں ہی نظروں میں مجھے جانچ رہی تھی بغیر کچھ کہے۔

"تو گویا یہ طے ہے کہ ہمارے "رب سے" تعلقات بھی اب اختتام پذیر ہونے ہیں۔"

اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ جمائی مجھے لگا وہ کئی دنوں کا حساب چکا دینا چاہتی ہے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ایک بات تو بتاؤ شانزے! تم کس سے بھاگ رہی ہو... خود سے یا ہم سب سے؟" اس نے قدرے آگے کو جھک کر مجھ سے پوچھا تھا۔

میں نے ذرا سا ہنس کر اس کی بات کے اثر کو زائل کرنا چاہا مگر شاید میرے ہونٹ میرا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ونیزہ۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" ونیزہ نے ایک دم مجھے ٹوک دیا اور اس کے پریقین لہجے پر میں نے ایسے ہونٹ بھینچ لیے تھے گویا کبھی کھلے ہی نہ ہوں۔

"تم جو سارا دن لور لور سڑکوں پر خوار ہوتی ہو یہ فرار نہیں تو اور کیا ہے شانزے۔" ونیزہ کی آواز قدرے تیز تھی۔

"یونیورسٹی میں کوئی کلاس اٹینڈ کرو تو تم اس طرح

بے زار و بے چین بیٹھی ہوتی ہو جیسے تمہیں زبردستی وہاں لا بٹھایا ہو۔۔۔ صبح سے شام تک تم انجانے راستوں پر بھٹکتی رہتی ہو اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ کون ہے جس نے کھانا کھایا تھا اور کتنے پہروں سے تم بھوکی ہو۔ گھر جانے کا خیال تمہارے لیے سوہان روح بن جاتا ہے باپ تو چلو سوتیلا ہے مگر تمہیں تو ماں کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں خود اپنی ذات کو بھی بری طرح اگنور کر رہی ہو تم کیا پہننا ہے کیا اوڑھنا ہے تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا اور اوپر سے تم نے وہ چلڈرن ہوم جوائن کر لیا ہے جبکہ ایسے کسی بھی ادارے کے بارے میں تمہارا اولین خیال یہ ہوتا تھا کہ یہ محض روپے کمانے کا اور نام کمانے کا ذریعہ ہے اور کچھ نہیں اور اب تم ایسے ہی ایک ادارے کے لیے پاگل ہوتی جا رہی ہو اتنا وقت اگر تم اس چلڈرن ہوم میں ضائع کرنے لگی۔۔۔"

"شٹ اپ ونیزہ جسٹ شٹ اپ۔۔۔" میں روہانسے لہجے میں چیخ اٹھی تھی۔ مزید برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی مجھ میں میں نے دونوں ہاتھوں میں سر گرا لیا۔ آنسو جیسے امڈ آنے کو بیتاب تھے مگر میں انہیں ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

اور آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ کتنا اطمینان بخش ہوتا ہے وہ احساس جب کوئی انسان سب کچھ جاننے کے باوجود انجان بن کر آپ کا بھرم رکھ لے۔

اور

اور کتنا اذیت ناک ہوتا ہے احساس کا وہ لمحہ جب وہی شخص آپ کے سامنے بڑی بے دردی سے آپ کی ذات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دے۔

"تم بہت بدل گئی ہو شانزے۔۔۔" چند لمحوں بعد ونیزہ کی آواز دوبارہ سنائی دی تھی۔

"بہت زیادہ بدل گئی ہو اور میں اس تبدیلی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے تم نے کبھی اداس لہجے میں مجھ سے یہ نہیں کہا کہ "آؤ ونیزہ ٹیرس پر چلیں" اور وہاں چل کر تم مجھ سے اپنا دکھ' اپنی پریشانی شیئر کرو کوئی پرابلم ڈسکس کرو۔ تم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں پاپا یاد آتے ہیں۔ اور تم نے تو کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ احتشام احمد سے شادی کے فیصلے پر تم ممی سے ناراض ہو۔ حالانکہ فطری طور پر یہ سب باتیں تمہیں مجھ سے شیئر کرنی چاہیے تھیں مگر تم نے نہیں کیں۔ کسی اور سے نہ سہی مگر کم از کم مجھ سے تو کچھ کہو اپنی ذات کے گرد اتنی بلند فصیلیں کھڑی کر لی ہیں تم نے کہ تم تک رسائی میرے لیے کار دشوار بن کر رہ گئی ہے۔ مگر یہ بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ شانزے ایمان کہ آج میں وہ سب کچھ سن کر رہوں گی جو تمہارے دل میں ہے۔" گویا وہ تہیہ کیے بیٹھی تھی۔

"کیا سننا چاہتی ہو تم؟" میں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ضبط گریہ سے سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں اس پر جما دیں۔

"یہ کہ پاپا مجھے یاد آتے ہیں۔۔۔ تو سن لو ونیزہ داور کہ میں اپنے پاپا کو کبھی نہیں بھولی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ میرے ساتھ ہوتے ہیں میں چلتی ہوں تو وہ میرے ہم قدم ہوتے ہیں۔ میں کھاتی ہوں تو وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں میں روتی ہوں تو وہ میرے آنسو پونچھتے ہیں۔" میرے اندر جیسے کوئی جوار بھاٹا اٹھا تھا۔

"اور وہ احتشام احمد ہاں میں اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے اس شخص سے نفرت ہے اور اس سے بھی زیادہ نفرت مجھے اس عورت سے ہے جسے تم میری ماں کہتی ہو مجھے اس کی صورت تک دیکھنا گوارا نہیں میں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی اس کے وجود سے اٹھتی مہک سے مجھے وحشت ہوتی […] سن رہی ہو ونیزہ مجھے اپنی ماں سے شدید نفرت […]" میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے عین اس کے […] کھڑی ہوئی تھی۔ اسے غالباً اس […] توقع نہیں تھی۔ اسی لیے حیران پریشان […] ساکت رہ گئی تھی۔

"میں گھر اس لیے نہیں جاتی کہ […] کے سائے سے بھی بچنا چاہتی ہوں۔ […] ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن […]"

"آر یو کریزی شانزے کیا اول فول […]" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر صوفے […]

ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"یہ اول فول نہیں ہے مس ونیزہ داور یہ وہی سچائی ہے جسے تم سننے کے لیے بے تاب تھیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"شانزے اچھا تم بیٹھو تو سہی۔" اس نے مجھے ٹھنڈا کرنا چاہا مگر میرے اندر جیسے کوئی لاوا ابل رہا تھا۔

"شانزے فار گاڈ سیک بیٹھ جاؤ۔" اس نے مجھے صوفے پر دھکیلا اور پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" میرے قطعی لہجے پر اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

"آئی کانٹ بیلیو اٹ شانزے یہ سب تم کہہ رہی ہو اور وہ بھی۔۔۔"

"ہاں۔" میں نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

"یہ میں کہہ رہی ہوں اور اپنی ماں کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔"

"اسی بات پر تو یقین نہیں آ رہا شانزے کوئی بیٹی اپنی ماں کے بارے میں ایسا بھی کہہ سکتی ہے۔" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں ماں کے بارے میں یہ سب نہیں کہا جا سکتا لیکن تمہاری نصیحہ آنٹی ایک چلتا پھرتا ڈیکوریشن پیس ہیں اینڈ نتھنگ مور۔" میں زہر خند لہجے میں کہتی ہوئی ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ ونیزہ حیرت و بے یقینی کے باعث مجھے روکنے کی کوئی معمولی سی کوشش بھی نہیں کر پائی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

[…] کی آرزو میں مقدر بھی سو گئے
[…] چلی ہوا ایسی کہ اپنے بھی کھو گئے
خوب تھا تمہارا انداز دوستو!
[…] بن کے آئے تھے کانٹے چبھو گئے

"[…] خیال ہے انکل شانزے کو کسی سائیکاٹرسٹ [کی ضرو]رت ہے۔" ونیزہ کی آواز پر قدم جیسے زمین نے […]

"[…] کہہ رہی ہے ونیزہ۔" میں نے آہستگی سے ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ ونیزہ احتشام احمد کے سامنے بیٹھی بڑی سنجیدگی سے مشورہ دے رہی تھی۔

"ایک نارمل فرد اس طرح بی ہیو نہیں کرتا انکل مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا انکل کہ یہ وہی شانزے ہے جسے میں بچپن سے جانتی ہوں اسے تو میں نے کبھی معمولی سا غصہ کرتے بھی نہیں دیکھا تھا مگر کل اسے اس حالت میں دیکھ کر میں تو سخت پریشان ہو گئی تھی انکل آپ جلد از جلد کسی سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کریں۔"

پردہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور میں دم بخود سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ اور یہ ونیزہ تھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ جانتی ہے سمجھتی ہے اور جس کا خیال ہے کہ مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔ میرے حلق میں پھندا سا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لیے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔

"اور اگر میں نے دل کی ساری بات تم سے کہہ دی ہوتی ونیزہ تو شاید اس وقت میں کسی مینٹل ہاسپٹل میں پہنچا دی گئی ہوتی۔" میں انہی قدموں واپس ہو لی تھی۔

"اور کیا ہوتا اگر آج میں ممی کے اصرار پر "دارالاطفال" میں ہی رک گئی ہوتی' سر شام گھر نہ لوٹتی اور انجان ہی رہ جاتی کچھ بھی نہ سن پاتی کم از کم ونیزہ کی زبانی تو یہ سب نہ سن پاتی اس ونیزہ کی زبانی جو مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ جانتی اور سمجھتی تھی۔" میں بے دم ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ غائب دماغی سے گاڑی چلاتے ہوئے میں نجانے کن کن راستوں سے ہوتی ہوئی ایک بار پھر اس گوشہ عافیت میں جا پہنچی تھی۔

"ارے تم گئی نہیں؟" شہزینہ نے حیرت سے مجھے دیکھا کاش نہ گئی ہوتی۔

"ہاں گئی تھی کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے دوبارہ آ گئی۔" میں پھیکی سی ہنسی ہنس دی تھی اور ایک بار پھر اسپیشل چلڈرن سیکشن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"شانزے کو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔"

خود کو کئی کاموں میں مشغول کر لینے کے باوجود میں اس ایک جملے سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکی تھی۔

"تو کیا میں واقعی ابنارمل ہو چکی ہوں۔" میں نے اپنی دکھتی ہوئی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے سوچا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک قدرے الگ تھلگ گوشے میں آ بیٹھی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"معلوم نہیں دارالاطفال میں قدم رکھتے ہی ایک طویل اور پرسکون نیند کی خواہش دل میں ہمکنے کیوں لگتی ہے؟ اور کیا میں نہیں جانتا کہ ایسی کسی بھی خواہش کی تکمیل کم از کم اس جنم میں ممکن نہیں اور بالفرض آواگون کے چکر میں میں نیا جنم لے بھی لوں تو بھی مجھے یقین ہے کہ لاحاصل جستجو اور بے نام مسافت کے سوا میرے مقدر میں اور کچھ نہیں ہو گا۔"

اس نے تھکن زدہ بوجھل پلکیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آج کی رات کچھ زیادہ روشن نہیں تھی۔ فضا ایک غیر محسوس سی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ تیسری تاریخ کا چاند مثال ابرو بڑے تفاخر سے چشم فلک پر تنا ہوا تھا۔ بھولی بھٹکی سرد ہوا کا جھونکا کبھی کبھار درختوں سے ٹکراتا تو پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کسی آہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ وسیع و عریض لان اس وقت نیم تاریکی کی زد میں تھا۔ نظریں یونہی گھماتے ہوئے وہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے بے حد حیرت سے نیم تاریکی میں ڈوبے اس وجود کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو گلزار خان نے اسے اطلاع دی تھی کہ تمام ممبران جا چکے ہیں اور دیگر کمروں کو لاک کر دیا گیا ہے۔

"تو پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟" وہ ایک جھٹکے سے مڑا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا تھا۔

معلوم نہیں اس کے قدموں کی آہٹ سنی نہ گئی تھی یا جان بوجھ کر سنتے ہوئے بھی نظر انداز کر دی گئی تھی۔ بہرحال اس وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے لب بھینچے بغور اس ساکت وجود کو دیکھتا رہا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سینے میں بند سانس خارج کی تھی تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"مس شانزے ایمان۔" اس کی تصدیق چاہی تھی۔ مخالف سمت میں ... تھی مگر بیٹھنے کے انداز میں کوئی ... تھی۔ وہ ابھی تک دونوں بازو ... جھکائے بیٹھی تھی۔ شال کندھے ... بنچ پر اور تو کچھ گھاس پر لٹک رہی تھی ... میں خود سے بھی بے نیاز لگ رہی تھی۔

"آر یو آل رائیٹ؟" اس نے قدرے ... کہا۔ اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھایا ... اس تاریکی میں بھی کرب کے آثار اس کے ... نمایاں تھے۔

"آپ گھر نہیں گئیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"گھر۔" وہ یوں بولی تھی جیسے یہ لفظ اس کے ... کمل اجنبی ہو۔

"میرا کوئی گھر نہیں تقدی صاحب میں تو ... مکان میں رہتی ہوں اور بہت سی دیواروں چھتوں دالانوں دلہیزوں سے مکان گھر تو نہیں بن جاتے ناں؟" وہ بجھے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا جلتی ہوئی پیشانی نے اس کے خیال کی مکمل تصدیق کی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر ہاتھ ہٹا لیا۔

"آئیے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے بہت نرمی سے کہا تھا۔

"میرا وہاں جانے کو دل نہیں چاہتا۔" اس کے لہجے سے بے بسی و بیچارگی عیاں تھی۔

"مس شانزے پرندے ایک بار اپنا آشیاں چھوڑ دیں تو تنہا سورج تا عمران سروں پر چمکتا رہتا ہے خود کو زرد دھوپ کے حوالے مت کیجیے۔" تقدی نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھانا چاہا۔

"گاڑی کی چابی کہاں ہے؟" تقدی نے اس کے اترے اترے چہرے کو غور سے دیکھا اس نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جرسی کی جیب سے چابی

... ہاتھ پر رکھ دی تھی۔ ... آگے بڑھ گیا تھا۔ ... کون سا دکھ اس لڑکی کو ہر ... پہلی بار اسے دیکھا تھا تب ... آنسو بہاتے دیکھا تھا ... سرکشی ہے۔ کبھی ... کوئی بہت ہی عزیز ... کسی میلے میں کوئی بچھڑ گیا تھا ... اور زندگی کے اس برتاؤ پر ... بھی ہو۔" اس نے مڑ ... اس لڑکی کو دیکھا۔ باہنوں سے ... باہر تاریکی میں نجانے کیا کھوج

... رات کو پہلی بار سمندر میں ڈوبتے دیکھا ... ایک لمحے کے لیے سوچا تھا۔ ... کیوں اگر آپ برا نہ منائیں تو؟" اس ... ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

... شانزے اپنا دکھ تو بس اپنا ہی ہوتا ہے ناں؟ ... تشہیر کر کے دوسروں کو اپنا تمسخر اڑانے کا ... دیتے ہیں؟" اس نے ذرا سی ذرا اس کی ... دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبائے ... تھی مگر ضبط کی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تھی۔ ... پلکوں کی باڑھ توڑ کر روانی سے بہہ نکلے تھے۔ وہ ... سے سرہانا کر رہ گیا۔

"زندگی اس طور نہیں گزرے گی جس طور آپ گزار رہی ہیں اس لیے آپ میری ایک بات مانیں شانزے۔" اس نے گاڑی "شانزے ولا" کے سامنے روکی اور پھر پورے کا پورا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ یوں کیجیے کہ اپنے مقدر کے پیوند زدہ پیرہن کو تسلیم و رضا کے خوشنما لبادے سے ڈھانپ دیجیے تمنا کو زری کا آنچل اوڑھا دیں۔
اپنی نفرت کو محبت کے سمندر میں غرق کر دیں
اور
اپنے تمام تر احساسات کے گرد ایک سرد آہنی حصار کھینچ دیں یقین کیجیے اس طرف کا دروازہ کھل جائے گا۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی۔

"آئی ایم سوری میری وجہ سے۔" وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بمشکل بولی تھی۔

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"کوئی بات نہیں مس شانزے۔"

"آپ واپس کیسے جائیں گے تقدی صاحب گاڑی لے جائیے۔" اپنی پشت پر اس کی آواز سنائی دی تو وہ بے اختیار رک گیا تھا۔ پھر پلٹ کر بے اختیار اس کی طرف دو قدم بڑھ آیا۔

"ڈونٹ وری میرے قدم اس زمین کے ساتھ ساتھ گردش کرتے ہیں۔ میں یونہی چلا جاؤں گا۔"

اس نے ایک نظر اس کے تپتے ہوئے چہرے اور سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھا تھا اور واپس پلٹ گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سنا ہے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے؟" دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ولید احتشام کی آواز سنائی دی تھی اور میں نے غیر ارادی طور پر ہی کروٹ بدل لی تھی۔

"شٹ اپ ولید بھائی آپ کب واپس آئے اور یہ شانزے آپ کی دشمن کب سے ہو گئی؟" وینزہ نے ناں۔ میری ڈیفنس کے خیال سے پہلے اسے تنبیہہ کی تھی اور پھر فوراً سوال داغ دیا تھا۔

"کل رات ہی واپسی ہوئی ہے۔ حماد بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا اور محترمہ دشمنوں کا لفظ میں نے محاورتاً استعمال کیا ہے ویسے ہوا کیا ہے؟" ولید کا اشارہ میری طرف تھا۔

"ٹمپریچر تھا احتشام انکل بتا رہے تھے کہ کل رات بہت دیر سے واپس آئی تھی اور لاؤنج میں صوفے پر ہی سو گئی تھی۔ شاید سردی کی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔" وینزہ نے بہت دھیمی آواز میں بتایا تھا۔

"وینزہ آپ دونوں کی تو بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے کیا آپ سے بھی کچھ شیئر نہیں کرتی یہ آئی مین بھی اس

نے کچھ کہا نہیں آپ سے ڈیڈی کے بارے میں
بات۔"

"میرا خیال ہے ہم لوگ باہر چل کر بات کرتے
ہیں۔" ونیزہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا اور چند
لمحوں بعد قدموں کی مدھم سی چاپ کے ساتھ دروازہ
کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی تو میں نے دھیرے
سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"اور کیا میں نہیں جانتی ونیزہ تم باہر جا کر کیا کہو گی؟
یہی ناں کہ "شانزے کو کسی سائکاٹرسٹ کی ضرورت
ہے۔" دو آنسو چپکے سے آنکھ کے گوشوں سے نکلے تھے
اور بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"اور جمشید آفندی! تم کہتے ہو کہ میں اپنے مقدر
کے پیوند زدہ پیرہن کو تسلیم و رضا کے خوشنما لبادے
سے ڈھانپ دوں۔"

"دنیا بہت آسان سمجھ رکھا ہے تم نے تلخی کو نرمی
کے آنچل میں سمیٹ لینا اور نفرت کو محبت کے سمندر
میں غرق کر دینا۔
ہاں یقیناً" جینا بہت سہل ہو جائے گا مگر انسان
ہونے کے ناتے اپنے تمام تر احساسات کو کسی آہنی
قلعے میں مقید کیسے کر دوں؟
مگر تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ زندگی اس طور ہرگز
نہیں گزاری جا سکتی، سو تمہارے مشورے پر ایک بار
عمل تو ضرور کروں گی۔" میں نے آخری بار آنسوؤں کو
کھل کر بہہ جانے دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ہیلو ایوری باڈی۔" میں نے بشاش لہجے میں کہا تو
آفس میں بیٹھا ہر فرد اپنی جگہ پر چونک گیا تھا۔
"آؤ آؤ بادشاہو۔ کہاں گم تھے اتنے دنوں سے"
زوار شاہ نے اپنی ٹانگیں پیچھے ہٹاتے ہوئے مجھے
گزرنے کی جگہ دی۔
"عاصم بھائی ہماری عینک کہاں ہے۔" رضا نے میز
پر ادھر ادھر ہاتھ مارا۔
"بھائی عینک آپ کی ناک پر رکھی ہے۔" عاصم
نے بتایا۔
"ہمارا [illegible] حاضرین جو خاتون ابھی
ابھی آئی ہیں یہ اپنی شانزے کی ہمشکل نہیں لگ
رہی ہیں؟" اس نے عینک درست کرتے ہوئے بغور
مجھے دیکھا۔
"میرا خیال ہے چھوٹو تمہیں اپنی عینک کا نمبر بدلوا
لینا چاہیے میں شانزے ہی ہوں اور ذرا یہ تو بتاؤ یہ
خاتون کس کو کہا ہے تم نے۔" میں نے اسے کڑے
تیوروں سے گھورا۔
"بندہ اس گستاخی پر معافی چاہتا ہے مگر یہ تو عرض
کیجیے اتنا عرصہ کہاں گزرا؟"
"میں بیمار تھی اور زیادہ عرصہ نہیں صرف ایک
ہفتہ۔"
"واہ۔ اگر بیماری انسان کو اتنا فریش کر دیتی ہے تو
پھر مہینے میں ایک آدھ بار تو ہر بندے کو بیمار ہونا
چاہیے۔"
"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے رضا آج تم بہت فریش
لگ رہی ہو۔" رحمہ نے ستائشی نظروں سے میرے
ڈارک براؤن اینڈ وائیٹ فور پیس وول ڈریس کو دیکھا۔
"رحمہ جی صرف فریش نہیں پیاری بھی لگ رہی
ہیں۔" رضا کے لہجے میں شرارت تھی۔
"چھوٹو آئی تھینک تمہاری نظر ابھی تک میرے
جوتوں پر نہیں پڑی۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہتے
ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔
"نہیں تو! تمہارے جوتے بھی بہت اچھے
ہیں۔" رضا نے کھسیا کر اس طرح پینترا بدلا تھا کہ
سب لوگ بے اختیار ہنس دیے تھے۔ عین اسی وقت
دروازہ کھول کر تیزی سے کوئی اندر آیا تھا اور [illegible]
تفندی کو سامنے دیکھ کر سب لوگ احتراماً کھڑے ہو
گئے تھے۔ وہ سر کے اشارے سے بیٹھنے کا کہتے ہوئے
عاصم کی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تھا۔
"مسز روزی وائیٹ سے بات ہوئی ہے [illegible]
ویک پاکستان پہنچ رہی ہیں۔" دونوں ہاتھ ٹیبل پر
جمائے قدرے جھک کر وہ عاصم سے مخاطب ہوا تھا
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب [illegible]
روح تک آئی تاثیر مسیحائی [illegible]
میری نظریں سنہری رو میں والے [illegible]

جا کے ٹھہر گئی تھیں۔ گزشتہ کسی رات کا کوئی لمحہ ایک
دم سے روشن ہو گیا تھا۔
"کچھ لوگ روح کے مسیحا ہوتے ہیں اور یہ شخص
بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔" میری نظروں کا
زاویہ اس وقت بدلا تھا جب اپنی بات مکمل کر کے اس
نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور
دروازے کی طرف پلٹ گیا تھا۔
"اور ہاں۔" دروازے سے نکلنے سے پہلے اس نے
ایک مرتبہ پھر سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی
تھی۔
"آپ لوگوں نے بھی "انا اخمتووا" کو پڑھا ہے
اس کا کہنا ہے۔
"ہمارے آنسو سے بے نیاز غموں کا کوئی مقابلہ
نہیں کر سکتا اس میں تفاخر اور سادگی ہے۔"
اس کی ساحرانہ آنکھیں ایک لمحے کے لیے میرے
چہرے پر ٹھہریں اور دوسرے لمحے وہ آفس سے باہر جا چکا
تھا میں نے گہری سانس لے کر دروازے سے نظریں
ہٹالی تھیں۔
"واہ کتنی اچھی بات کہی ہے تفندی صاحب
نے۔" رضا نے سر دھنتے ہوئے کہا۔
"تفندی صاحب نے نہیں اس نے کہی ہے۔"
[illegible] نے اسے ٹوکا۔
"کس نے؟" رضا نے جان بوجھ کر کہا تو شنزینہ کو
[illegible] دیکھ کر میں نے فوراً بات بدل دی۔
"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ میرے ذہن میں ایک
زبردست آئیڈیا ہے وہ سنو!"
[illegible]" سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔
[illegible] ہم سب بچوں کے ساتھ پکنک منانے
[illegible]
[illegible] گڈ آئیڈیا۔" رضا اپنی کرسی سے اچھل
[illegible] سب بھی اس آئیڈیے سے پوری طرح
لہٰذا تفندی صاحب سے اجازت اور تمام
[illegible] عاصم کے سپرد کر کے باقی سب لوگ بچوں کو
لے کے بھاگے تھے اور جب ایک روز موسم
[illegible] دھوپ ہر چیز کو بڑی محبت سے چھو رہی
تھی "دارالاطفال" کے مکین پکنک پر جانے کو تیار
تھے۔ ننھے بچوں کے لیے ہوم پکنک کا اہتمام کیا جا رہا
تھا۔
"اور اگر [illegible]
[illegible]
[illegible] بچے جان بوجھ کر اس کو تنگ کر رہے تھے [illegible]
خوشی تک ہو رہا تھا۔
"کتنے عجیب لوگ ہیں یہ آج کل جب کہ انسانوں
کا خون سفید ہوتا جا رہا ہے یہ لوگ اپنا پیار اور
چاہتیں، اپنی توجہ بالکل غیر بچوں میں اس طرح بانٹ
رہے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے وجود کا حصہ ہوں ان
لوگوں کے دل کتنے خوب صورت ہیں ناں شنزینہ۔"
"ہوں۔" شنزینہ نے ہنکارا دیا۔
"اور یہ اپنا زوار شاہ بالکل درویش ہے سمندر جیسا
دل ہے اس کا۔" میں نے کھدر کے کرتے اور جینز میں
ملبوس زوار شاہ کو دیکھا۔
"ہوں۔" شنزینہ نے ایک بار پھر غائب دماغی سے
ہنکارا بھرا تو میں محسوس کیے بنا نہ رہ سکی۔ الجھ کر میں
نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ پر
ٹھوڑی جما کے وہ میری طرف بالکل بھی متوجہ نہیں
تھی۔ میں نے حیرت سے ایک نظر اسے اور پھر اس کی
نظروں کے تعاقب میں عین سامنے دیکھا تھا اور پھر
بے اختیار چونک گئی تھی کیونکہ مرکز نگاہ عاصم تھا۔
درخت سے ٹیک لگائے دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ اسمر
سے محو گفتگو تھا۔

بلیک پینٹ اور بلیک جرسی میں سلیقے سے بنے ہمارے بالوں کے ساتھ وہ خاصا مہذب لگ رہا تھا۔ چہرے پر ازلی طمانیت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ تبسم کی مسکراہٹ بھی جھلک رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر مڑ کر شنزینہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں عاصم کا عکس نمایاں تھا اور چہرے پہ محبت کا ایسا خوب صورت تاثر ابھرا ہوا تھا کہ پھر میں نے اسے کیف آگیں خیالات سے نکالنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"دیکھیں محترمہ آپ خوامخواہ بدتمیزی کر رہی ہیں۔"

"کیا؟ بدتمیزی میں کر رہی ہوں یا آپ پہلے ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے اب زبان بھی چلانے لگے ہو اور مجھے تو لگتا ہے تمہارا دماغ بھی چل گیا ہے۔" رضا کی جھنجلائی آواز کے ساتھ ایک تیز نسوانی آواز سن کر ہم سب لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

رضا بے چارہ گردن کھجاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور وہ پٹاخہ سی لڑکی دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔

"آج تو بری طرح پھنسا ہے رضا۔" اس لڑکی کے تیور دیکھتے ہوئے شنزینہ نے کہا تھا۔ زوار شاہ، عاصم اور اصغر حقیقت حال جاننے کے لیے فوراً اس طرف بڑھ گئے تھے۔

"دیکھیں محترمہ آپ خوامخواہ بات بڑھانے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ آپ کو کوئی چوٹ ووٹ بھی نہیں آئی اور میں ہاتھ پاؤں چلاؤں یا زبان آپ کو اس سے مطلب اور آخری بات یہ کہ میرا دماغ چلتا نہیں ہے گھومتا ہے اور جب گھوم جائے تو پھر میں سامنے والے بندے کا بالکل لحاظ نہیں کرتا اور یوں بھی آپ کے لیے تو میرا ایک پیچ ہی کافی ہوگا۔" آخری جملہ بہت چبا کر تفاخرانہ انداز میں مکا لہراتے ہوئے کہا گیا تھا۔

"کیا؟" مارے صدمے کے لڑکی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ زمین پہ پسکڑا مار کر رونا شروع کرتی عاصم نے قصہ دریافت کر لیا تھا۔

"دیکھیں بھائی صاحب یہ پارک ہے کوئی جوڈو کراٹے کا کلب تو نہیں۔" وہ فوراً عاصم سے شکایتی لہجے میں کہنے لگی۔

"میری بال اس طرف آگئی تھی میں جونہی اٹھانے کے لیے اس طرف آئی یہ صاحب جھٹ سے فلائنگ کک لگانے کو اچھلے وہ تو میں ہی عقلمند تھی کہ جھٹ سے نیچے بیٹھ گئی اور یہ محترم اڑتے ہوئے میرے اوپر سے گزر گئے ورنہ میرے ہونے والے ہزبینڈ تو شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جاتے۔" بات کے اختتام پر لڑکی کا لہجہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"سفید جھوٹ ہے یہ۔" رضا تڑپ اٹھا تھا۔

"عاصم بھائی میں تو بچوں کو فلائنگ کک کا داؤ سکھا رہا تھا اور میرا نشانہ یہ سامنے والا درخت تھا یہ محترمہ نجانے کہاں سے ٹپک پڑیں بیچ میں۔" رضا نے بھی [illegible] کر کہا تھا اور اس سے پہلے کہ لڑکی کوئی جوابی حملہ کرتی عاصم نے بڑے بچاؤ سے دونوں کو خاموش کرا [illegible] سلجھے ہوئے انداز میں اس لڑکی سے معذرت [illegible] بڑے [illegible] تھی۔ معذرت قبول کرنے کے بعد وہ پٹاخہ [illegible] لی تھی [illegible] نظروں ہی نظروں میں رضا کو کچا چباتے ہوئے [illegible] تھی۔ رضا نے طویل سانس کھینچ کر دونوں ہاتھ [illegible] کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور اس [illegible] بزم موڈ کو درست کرنے کے لیے رضا نے فوراً [illegible] دسترخوان بچھانا شروع کر دیا تھا۔

پکنک سے واپسی پر تمام بچوں کو [illegible] پہنچا کر جب گھر جانے کی باری آئی [illegible] کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری [illegible] بخوشی نبھا کر جب میں گھر پہنچی [illegible] میں کوریڈور میں ٹہل رہے تھے [illegible] نظرانداز کر کے میں آگے بڑھ [illegible] محسوس کیا تھا کہ مجھے دیکھتے [illegible] کے لیے بے اختیار کھلے تھے [illegible] لب بھینچ لیے تھے اور اب [illegible] ہوئے میں نے دیکھا [illegible] دروازہ کھول رہے تھے۔ [illegible] جو گویا میرے انتظار [illegible] تھا۔" میں استہزائیہ انداز [illegible]

ہنستی سونے کے لیے بستر پہ آگئی تھی۔ تھکن اور نیند کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ میں جلد ہی غافل ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

کلاسز آف ہو چکی تھیں۔ بچے قطار در قطار عمارت کے رہائشی حصے کی طرف جا رہے تھے اور میں شاویز اور فانی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے درحقیقت شنزینہ کی منتظر تھی جو مجھے صرف دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی اور اب پورے پندرہ منٹ کے بعد بھی عاصم کے آفس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ شاویز اور فانی بھی رخصت ہو گئے اور میں پلر سے ٹیک لگائے یونہی آسمان پہ ڈولتے پرندوں کو دیکھتی رہی [illegible] پیچھے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو میں شنزینہ کی [illegible] میں مڑ کر دیکھنے لگی۔ مگر دروازہ تقدیسی [illegible] آفس کا کھلا تھا۔

"آپ ابھی تک گئی نہیں۔" مجھے دیکھ کر وہ ادھر آ [illegible] ہاتھ میں کی رنگ اس بات کی نشانی تھی کہ وہ [illegible] جانے کے لیے نکلا ہے۔

"شنزینہ کا انتظار ہے کہہ رہی تھی کہ میں [illegible] کر دوں۔" میں نے اس کی طرف رخ [illegible] ہوئے کہا۔

"[illegible] صاحب کل آپ ہمارے ساتھ پکنک پہ [illegible] سچ ہم نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"[illegible]" اس نے استفہامیہ نظروں سے [illegible] ہو گئی۔

"[illegible] نے اس لیے کیا ہے کہ باقی سب [illegible] کے عادی ہیں وہ کبھی ایسی [illegible] مس نہیں کرتے۔"

"[illegible] صاحب مجھے تو آپ کی کمی بہت [illegible]" میں نے ایمانداری سے اعتراف [illegible] ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئی

[illegible] مسکرایا تھا مگر اس لمحے بجلی سی [illegible] چہرے پہ اجنبی سی لگی تھی۔

"[illegible] محسوس ہوتی ہے۔ میں بہت [illegible] اسی لیے کوشش کرتا ہوں کہ کم وقت میں زیادہ کام نمٹا سکوں۔" اس نے پکنک میں شمولیت نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

"کام کرنا اچھی بات ہے تقدیسی صاحب لیکن جسمانی و ذہنی تندرستی کے لیے ایسی تفریحات میں حصہ لیتے رہنا چاہیے اور خاص طور پہ آپ جیسے انسان کو کہ جس پہ بہت سے لوگوں کی خوشیوں کا دار و مدار ہو۔"

"ارے لگتا ہے آپ کی کشتی بھنور سے نکل کر کنارے تک آ پہنچی ہے۔ اب آپ مشورے بھی دینے لگی ہیں۔" اس نے خوشگوار حیرت سے کہا تھا۔

"نہیں میری کشتی جس طوفان کا شکار ہوئی تھی اس کے بعد کنارے کی توقع ہی عبث ہے۔ وہ تو اپنے مسافر سمیت ڈوب چکی۔ میں تو آپ کے مجرب نسخے کی بدولت اس قابل ہوئی ہوں کہ خود کو زندوں میں شمار کر سکوں۔ وہ کسی نے کہا ہے ناں کہ۔

ہم نے یہ سوچ کر جینے کا ہنر سیکھ لیا
درد رکھنا ہے تو پھر دیدۂ تر کیا رکھنا"

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں اداسی گھل گئی تھی۔ جسے غالباً وہ محسوس کرتے ہوئے بھی نظرانداز کر گیا تھا۔

"ڈیس لائک اے گڈ گرل زندہ رہنے کے لیے یہ اصول بہترین ہے۔" اس نے نارمل لہجے میں کہا اور پھر آستین ذرا سے اونچی کر کے وقت دیکھا۔

"اوکے میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اس لیے مجھے اب چلنا چاہیے۔"

اس نے جیسے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ پلٹ گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

میں نے کروٹ بدل کر گھڑی پہ نظر ڈالی تو گھنٹے کی سوئی بارہ کے ہندسے پر لرز رہی تھی۔

"اوہ گاڈ۔" میں نے جھنجلا کر تکیہ دوبارہ منہ پر رکھ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک وقت تھا جب میں یونیورسٹی سے واپسی پر جی بھر کے سویا کرتی

تھی اور رات کے اس پہر جب میری آنکھ کھلتی تھی تو
میں فوراً ”بستر چھوڑ دیا کرتی تھی۔ پاپا اپنی تمام کاروباری
مصروفیات اس وقت تک نمٹا لیا کرتے تھے یا پھر کل
تک ملتوی کر دیا کرتے تھے اور چونکہ اس وقت تک
ملازمین اپنے کوارٹرز میں جا چکے ہوتے تھے اس لیے
میں اور پاپا لاؤنج میں بیٹھا کرتے تھے اور پھر اس دوران
میں ہم ڈھیروں ڈھیر باتیں کیا کرتے تھے۔ ہر موضوع پر
میں اپنے سارے دن کی روداد انہیں سناتی اور وہ اپنا ہر
دکھ مجھ سے شیئر کیا کرتے تھے اور ان کے بعد یہ وقت
کس قدر مشکل سے گزرتا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنی
روٹین بدل لی تھی اور آج تو محض تھوڑی دیر آرام کی
خاطر میں بستر پہ لیٹی تھی، نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔
دوبارہ نیند کا آنا محال تھا اس لیے میں اٹھ بیٹھی تھی۔
بال سمیٹتے ہوئے میں نے یونہی کھڑکی کا پردہ سرکا کر
دیکھا۔ سیاہ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور کتنے
دنوں بعد یہ منظر دیکھنے کا موقع ملا تھا ورنہ تو سرمئی بادل
آسمان کو ذاتی جاگیر سمجھ کر ڈیرہ ڈالے رکھتے تھے۔
وقت گزاری کے لیے میں نے یونہی کھڑے کھڑے
پورے کمرے میں نظر دوڑائی۔
”کیا کیا جائے؟“ میوزک سننے کو دل نہیں چاہ رہا تھا
اس لیے اسٹیریو کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔
کتابوں کو عرصہ ہوا ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی پاپا کے
بغیر کچھ نیا پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔ ویڈیو گیم کھیل کھیل کر
میں سخت بور ہو چکی تھی۔ آخر میں میری نظر کمپیوٹر پہ
جا کر ٹھہر گئی تھی۔ پاپا نے اپنی زندگی میں ہی انٹرنیٹ
کنکشن لے رکھا تھا تو اس وقت یہی دلچسپ کام لگا
تھا مجھے فریش ہونے کے لیے اس وقت چائے یا کافی
ضروری تھی سو کرسی سنبھالنے سے پہلے میں اس
مقصد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا
دروازہ کھولا تو سیڑھیوں پر روشنی کا راستہ سا بن گیا تھا۔
ڈرائنگ روم میں اس وقت مکمل اندھیرا تھا البتہ ٹی وی
لاؤنج کی لائٹس آن تھیں۔ میں اطمینان سے چلتی
ہوئی اس طرف آ گئی تھی۔

میرا اک سپنا ہے
میں دیکھوں تجھے سپنوں میں
تو مانے نہ مانے
ہے تو بھی میرے اپنوں میں

میرے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی کوئی گنگنایا تھا اور
جہاں میں بری طرح چونکی تھی وہاں ناگواری کی ایک
تیز لہر بھی میرے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔
معلوم نہیں وہ میری آمد سے انجان تھا یا انجان
بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفے پہ دراز ایک کشن سر
کے نیچے اور دوسرا سینے پہ رکھے آنکھیں بند کیے وہ گنگنا
رہا تھا۔ پاؤں مسلسل حرکت میں تھا اور چہرے پہ بے
خبری مسکراہٹ جو اس وقت مجھے زہر لگی تھی۔
”معلوم نہیں کہاں کہاں سے لوگ منہ اٹھائے
چلے آتے ہیں اس گھر میں۔“ دل ہی دل میں پیچ و تاب
کھاتی ہوئی میں کچن میں آ گئی۔
”اچھا خاصا ڈرا کے رکھ دیا تھا اسٹوپڈ نے“ میں بڑ
بڑ کرتے فریج کی طرف آ گئی تھی۔
”میرے لیے کافی ود شوگر اینڈ کریم۔“ ”میرے ہاتھ
سے ملک پیک چھوٹتے بچا تھا۔ میں نے آواز
کی سمت دیکھا اور پھر وہیں اسٹول پر ڈھے گئی۔
لہجہ بھی مختلف تھا اور الفاظ بھی مگر لہجہ [illegible]
سا لگا تھا۔ جسم میں دوڑتے خون کی گردش ایک [illegible]
کے لیے تیز ہو گئی تھی۔
”اور مجھے لگا پاپا جیسے آپ نے پکارا ہو [illegible]
سانس لے کر میں دل کو تھپکتی اٹھ کر [illegible]
کیوں ایسی ان ہونیوں پر چونک چونک جاتا [illegible]
”کیا بنا رہی ہیں؟“ اب کے آواز دروازے [illegible]
ابھری تھی۔
”آئرش بلانڈ مسٹر ولید احتشام۔“ میں [illegible]
نکالتے ہوئے بہت مناسب انداز میں [illegible]
”ناٹ ــ ٹی ایم ناٹ ــ“ [illegible]
کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آیا۔“
لہجہ حد درجہ معصوم تھا مگر مجھے [illegible]
کو نرمی میں بدلنے کا کوئی ارادہ نہ تھا [illegible]
آ رہا تھا۔
”کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں [illegible]
یہاں سے چلی جاؤں۔“ میں نے [illegible]

نے فوراً ”نفی میں سر ہلا دیا۔
”آپ بخوشی اپنا کام کریں آئندہ آپ کو ڈسٹرب
نہیں کیا جائے گا۔“
”ویسے بائے دا وے ـــ“ چند لمحوں کی خاموشی
کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا تھا۔
”یونیورسٹی سے اتنی چھٹیاں کس خوشی میں کی جا
رہی ہیں۔“
[illegible] تف کرتے ہوئے میں نے تعجب سے اسے
دیکھا اس کا لہجہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ اسکول سے ڈھیر
ساری چھٹیاں کرنے والے بچے کی کلاس لے رہا ہو۔
”آپ نے بتایا نہیں۔“ اس نے فریج سے
کنفینسڈ ملک نکالتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔
”آپ میری جاسوسی کس خوشی میں کر رہے
ہیں۔“
”آپ اس غلط فہمی میں مت رہیے گا۔ مجھے
ہندی فلموں کا ہیرو بننے کا کوئی شوق نہیں ـــ ہاں
فون آیا تھا آپ کی [illegible] دوشیزہ کا اتفاق سے میں
نے ریسیو کیا تھا۔ بتا رہی تھیں کہ آپ کی لیو ختم
ہو گئی ہیں اور امتحانات بے حد قریب آ
[illegible] اس کے باوجود آپ یونیورسٹی کا منہ دیکھنے پہ
تیار نہیں۔“ اس نے کافی پھینٹتے ہوئے بتایا۔
”سوشل ورک کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دنیا
کے کاموں کو خدا حافظ کہہ دیا جائے آپ کو
[illegible] بھی توجہ دینی چاہیے۔“ بہت لاپروا سے
[illegible] نے کہا تھا۔
”شکریہ مگر یہ بھی دھیان میں رکھنا
[illegible] بندے کو اس کی ضرورت ہے بھی کہ
[illegible] کافی کا کپ اٹھا کر طنزیہ لہجے میں کہتی
[illegible] گئی تھی اور جب اپنے کمرے میں بیٹھ
[illegible] چسکیاں لیتے ہوئے کمپیوٹر کے سامنے
[illegible] کیا تو پھر وقت گزرنے کا احساس
[illegible] جب میں وہاں سے اٹھی تھی تو چار
[illegible] رہے تھے۔
[illegible] میں نے گلاس ونڈو سے باہر
[illegible] دھیرے دھیرے کھسک رہی
تھی۔ اور لان کی گھاس پر شبنم اپنا ڈیرہ جما رہی تھی۔
بے اختیار ہی میرا دل چاہا کہ اس ٹھنڈی گھاس پہ ننگے
پاؤں چلوں اور یہ خواہش کچھ اس قدر شدید تھی کہ
میں گرم شال اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر باہر آ گئی
تھی۔
”اور اگر کوئی مجھے اس وقت یہاں چہل قدمی کرتے
دیکھ لے تو فوراً ’میرے پاگل پن‘ پہ مہر لگا دے۔“ میں
دل ہی دل میں ہنسی تھی اور پھر کپکپاتے ہوئے میں
کتنی ہی دیر تک اپنی اس احمقانہ خواہش کی تکمیل کے
لیے لان میں ٹہلتی رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح آنکھ بھی دیر
سے ہی کھلی تھی اور ابھی میں غنودگی میں ہی تھی جب
اپنے ماتھے پہ نرم گرم انگلیوں کا لمس محسوس کرکے
میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دی
تھیں۔
”شانزے جانو کب تک سوتی رہو گی۔“ پھپھو کے
مسکراتے چہرے کے ساتھ ان کی شفیق آواز نے مجھے
پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔
”ارے ـــ“ میں بے اختیار ہی اٹھ کر بیٹھ گئی
تھی۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد پھپھو نے ہماری طرف آنا
بہت کم کر دیا تھا۔
”کب آئیں آپ“ میں نے محبت سے ان کا
ہاتھ تھام کر پوچھا۔
”ابھی ابھی ـــ جب تم سو رہی تھیں تم نے تو بھلا
ہی دیا ہے ہمیں اس لیے میں نے سوچا میں خود جا کر
دیکھ آتی ہوں۔“
”کہ شانزے کس حد تک سیانی ہو چکی ہے۔“ میں
نے دل ہی دل میں ان کی بات مکمل کی۔
”اچھا کیا آپ نے اسی بہانے آپ آئیں تو
سہی۔“ میں اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔
”آج کل کہاں مصروف رہتی ہو شانی یونیورسٹی
سے بھی بہت دنوں سے غیر حاضر ہو دوشیزہ بیچاری الگ
پریشان رہتی ہے کتنی بار تمہیں فون کر چکی ہے
موبائل تمہارا ہر وقت آف رہتا ہے کل تو وہ بری طرح

روری تھی۔ کہنے لگی شانزے مجھ سے ناراض ہے۔ ابھی کوئی کانٹیکٹ نہیں کر رہی۔" پھپھو چائے پیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ تم دونوں کے تعلق میں ناراضگی کی گنجائش نہیں ہے وہ یقیناً مصروف ہو گی۔" پھپھو بتا رہی تھیں اور مجھے دل ہی دل میں احساس ہو رہا تھا کہ میں دنیزہ کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔

"اس میں اس بیچاری کا کیا قصور تھا۔ نجانے میں غصے میں اس کے سامنے کیا کچھ کہہ گئی تھی جو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میں ایک سائیکک کیس بن چکی ہوں۔" اپنی جذباتیت میں دنیزہ کو دکھ پہنچانے پر میں گلٹی فیل کر رہی تھی۔

"نہیں پھپھو میں ناراض نہیں ہوں دنیزہ سے کل صبح یونیورسٹی تو ملوں گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو پھپھو کا چہرہ خوشی سے کھل گیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے کپ رکھتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں اب چلتی ہوں تم کسی روز گھر کا بھی چکر لگا لینا۔ تمہارے انکل بہت یاد کر رہے تھے تمہیں۔"

"اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے پلٹی تھیں۔

"رات کو جلدی گھر لوٹ آیا کرو اور کھانا وقت پر کھایا کرو کل لبنیٰ نے مجھ سے فون پر بات کی تھی بہت فکرمند تھی تمہارے بارے میں اس کا خیال رکھا کرو آخر کو ماں کا دل ہے پریشانی تو ہوتی ہوگی اس کو بھی تمہاری اس بدلی ہوئی روٹین سے۔" انہوں نے پیار سے مجھے سمجھایا تھا۔

"ویری اسٹرینج پھپھو کہ وہ میرے بارے میں فکرمند رہتی ہیں۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق تو ان کے سینے میں دل ہے ہی نہیں کجا کہ ماں کا دل۔" میں نے کندھے اچکا کر حیرت کا اظہار کیا۔

"اونہوں بری بات ہے یوں نہیں کہتے۔" انہوں نے سرزنش کی اور پھر ساڑھی کا پلو کھینچتی باہر نکل گئی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ایک طرف انسان بڑے طنطنے سے اشرف المخلوقات کا تاج سر پہ سجائے گھوم رہا ہے تو دوسری طرف یہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بستی دیکھ رہی ہیں مس شانزے ایمان۔ یہاں کسی کا کسی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں یہاں انسان مفلسی کی گود میں آنکھ کھولتا ہے اور بھوک کی گود میں جا سوتا ہے۔ یہاں غربت ماں کی گود ہے اور افلاس باپ کی شفقت یہاں کوئی بہن بھائی، دوستی کے رشتے کو نہیں ترستا۔ یہاں سب "روٹی" کو ترستے ہیں۔ ہماری بھری ہوئی تجوریوں میں سے اپنا حصہ چاہتے ہیں۔ اپنی محنت وصول کرنا چاہتے ہیں اور جب اپنی محنت کا معاوضہ بھی وصول نہیں کر پاتے تو اپنے مقدر کو کوسنے … چاہتے ہیں۔

آپ جانتی ہیں مس شانزے یہاں اگر کسی … سے اس کا بچہ گود لینے کی خواہش کی جائے تو وہ … خوشی خوشی ہمارے حوالے کر دیتی ہے۔ … پتھر کی بھاری سل رکھ کر وہ اس احساس … تشفی کرتی ہے کہ اس کا بچہ بھوکا نہیں رہے گا … پیٹ بھر کر کھانا کھائے گا چاہے کسی کی گود میں … ہم۔ ہم مغرور و متکبر لوگ اپنی ناک … کی زحمت ہی نہیں کرتے ہم نے کبھی … دیکھا ہی نہیں تو ہمیں معلوم … کس کے تن پہ کپڑا نہیں اور کون … ہے؟

کس نے تپتی سڑکوں … اور کون سردی سے ٹھٹھر … خاموش ہوا تو میں نے … شخص کو دیکھا جس کا لہجہ … لوگوں کا دکھ قطرہ قطرہ اس … میں نے ایک طائرانہ نظر … ڈالی۔

اور ٹھیک ہی تو کہا تھا اس … شدید موسم میں … اس پر لیدر کی جیکٹ …

… ٹیروں اور پھٹی پرانی پوشاکوں میں سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے چہرے پہ چھائی بے بسی، مردنی، زندگی سے بیزاری کی واضح علامت تھی اور یہ سب میرے لیے نیا ہی تو تھا، زندگی کا یہ روپ میں نے اس سے پہلے کب دیکھا تھا اور یہ محض اتفاق ہی تو تھا کہ آج میں اس شخص کے ساتھ یہاں چلی آئی تھی۔

"دارالاطفال" سے نکل کر کچھ دور جا کر جب ٹول ختم ہونے پر میں جھنجھلائی ہوئی ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی تھی تب ایک گاڑی میرے نزدیک آ رکی تھی اور اپنے سامنے جمشید تقدیری [?] کو دیکھ کر میں نے … سکون کا سانس لیا تھا۔ اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شہری آبادی سے دور ایک خانہ بدوش بستی میں ضرورت کی کچھ اشیاء پہنچانے جا رہا ہے تو میں نے … ساتھ جانے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔ محض … کے شوق میں اور یہ تو مجھے یہاں آ کر … ہوا تھا کہ یہ اندوہ ہم میں ایک تلخ اور بھیانک … روح کو جھنجھوڑ دینے والی۔

"دارالاطفال" کا ملازم افضل تمام چیزیں تقسیم کر چکا تھا تب ہم لوگ دوبارہ گاڑی … تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو لوگ چھٹنے لگے تھے اور پھر جب تک گاڑی موڑ … میں بیک ویو مرر سے ان لوگوں کی جو دونوں ہاتھ اٹھائے اس اجنبی … رہے تھے جو ان کے درد کا درماں … گھڑی بھر میں واپس لوٹ گیا تھا۔ وہ … اوجھل ہوئے تو میں نے ایک نظر … بھری بے نیازی سے وہ سڑک پہ … کھڑکی سے آتی سرد ہوا … سرخی سی پھیلا دی تھی۔

… اس پر جچتی بھی ہے کہ وہ … کردار کا بھی دھنی ہے۔" میں … نظریں ہٹا کر ونڈ سکرین پہ جما …

♥ ♡ ♡ ♥

"ارے یہ کون ہے؟"

"لگتا ہے اسے پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے؟"

"پوچھ لو کہیں راستہ بھول کر تو ادھر نہیں آ گئیں؟"

"شاید میری نظریں دھوکا کھا گئی ہیں۔"

"ارے کیا یہ واقعی تم ہو؟"

یونیورسٹی میں میری آمد پر اس اس طرح سے حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ میں بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

"بس بھی کرو یار تم لوگ تو خوامخواہ ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔" آصف نے ڈپٹ کر سب سے کہا تو میری نجات سی ہوئی۔

"ٹھیک ہے آصف بھائی ہم اس کی غلطی معاف کر دیں گے مگر جرمانہ لازم ہے۔" نوید دو کرسیاں پھلانگتا ہوا قریب آیا۔

"ہوں… مگر پہلے یہ بتایا جائے کہ جرمانے کی نوعیت کیا ہو گی۔ تاکہ ہم اس پر غور فرمانے کی زحمت کر سکیں۔" میں نے شاہانہ انداز میں کہا تھا۔

"کچھ زیادہ نہیں مادام۔ بس کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں معمولی سا لنچ۔" نوید نے فرمائش بھی یوں کی تھی جیسے دو روپے کی ریوڑیاں لینے کی خواہش ہو۔

"ویسے تو تمہیں پہلوان کا چھپر والا ہوٹل ہی سوٹ کرتا ہے مگر خیر تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔" میں نے اپنے کالر سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے کہا اور پھر کلاسز ختم ہونے پر ہم سب لوگ گاڑیوں میں پھنس پھنسا کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ وہاں اپنی دھینگا دھاڑ اور بے تکی حرکات سے لوگوں کو محظوظ کرنے اور انتظامیہ کو زچ کرنے کے بعد ہم لوگ باہر آئے تو دنیزہ اصرار کرتے ہوئے مجھے اپنی طرف لے گئی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں نے واپسی کا قصد کیا تو اس نے ڈھیر سارے نوٹس میرے حوالے کر دیے تھے۔

"پوزیشن لینا تو محال ہے لیکن اگر یہ ڈیڑھ ماہ بھی تم ڈٹ کر تیاری کرو تو بہت اچھے مارکس سے پرلیس [?] کلیئر کر لو گی۔" اس کے کہنے پر میں دل ہی دل میں خود کو پڑھنے پر آمادہ کرتے ہوئے نوٹس سمیٹ کر اٹھ گئی۔

ان پورے عرصے میں وہ غزنوے نے بڑی محنت اور [illegible] سے تیار کر رکھے تھے۔ گھر پہنچ کر نوٹس رٹنے اور ڈریس چینج کرنے کے بعد میں "دارالاطفال" آ گئی تھی۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے میں نے عادتاً عاصم کے آفس میں جھانکا تھا۔ عاصم کی سیٹ خالی تھی البتہ زوار شاہ تنہا بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا۔

"ہیلو!" میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بھئی کہاں رہیں آج سارا دن___" اس نے خوشدلی سے پوچھا تھا۔

"یونیورسٹی چلی گئی تھی۔" میں نے مختصراً بتایا۔

"محترمہ جس روز یونیورسٹی جانا ہو بتا کر جایا کریں رضا کا تو سمجھو آج سورج ہی طلوع نہیں ہوا یوں بھی آفس آتے ہی تمہیں دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہر کوئی آنے کے بعد تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔" اس نے کتاب میں بال پن پھنسا کر کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو زوار شاہ اب میں ایسی بھی اہم ہستی نہیں۔" میں نے اس کی بات کو محض مذاق سمجھتے ہوئے فوراً ٹالا اور بات بدلنے کے لیے عاصم کو پوچھنے لگی۔

"وہ آفندی صاحب کو سی آف کرنے ایئرپورٹ تک گیا ہے۔" اس نے عام سے انداز میں بتایا تھا اور میں ٹھٹک گئی تھی۔

"آفندی صاحب کو سی آف کرنے؟ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"امریکا گئے ہیں۔"

"کمال ہے کل شام ہی تو انہوں نے مجھے گھر ڈراپ کیا تھا مگر ایسا کوئی ذکر انہوں نے نہیں کیا۔" میں بے ساختہ ہی کہہ گئی تھی اور زوار شاہ نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔

"اور کیا اسے ایسا کوئی ذکر مجھ سے کرنا چاہیے تھا۔" زوار شاہ سے پہلے میرے دل نے ہی سوال داغ دیا تھا اور میں گڑبڑا گئی تھی۔

"کوئی کام تھا کیا؟" زوار شاہ نے میرے ایک دم خاموش ہو جانے پر [illegible]

"ہاں" میں [illegible]

"ہاں کام ہی تھا مگر [illegible] واپسی کا انتظار کیا جا سکتا [illegible] سنبھالا تھا۔

"اچھی بات ہے ویسے ابھی [illegible] تکیں گے دو ہفتے بعد "دارالاطفال" [illegible] ہے جس میں شرکت کے لیے [illegible] گا۔"

"ہوں اچھا پھر میں ذرا اپنی [illegible] جلد ہی وہاں سے نکل آئی تھی۔

"کس قدر بیوقوف ہوں میں بھی [illegible] جانے کی اطلاع کیوں دیتا میں بھی [illegible] معاملہ ہے اور اپنے ذاتی معاملات [illegible] ڈسکس کرنے لگا۔" میں نے خود کو [illegible] دیا تھا یہ اور بات کہ "دارالاطفال" کی [illegible] اتری گلابی شام مجھے اس لمحے بے حد اداس [illegible]

♥ ♡ ♡ ♥

میں بہت دنوں بعد اسٹڈی روم میں آئی تھی [illegible] تمام نوٹس اور کتابیں بھی میں یہیں اٹھا لائی [illegible] یکسو ہو کر پڑھ سکوں۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے میں نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے طائرانہ نظر اپنے اطراف میں ڈالی۔ ان گنت کتابوں سے شیلف بھرے ہوئے تھے۔ پاپا کو شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ ملکی شاعروں کے علاوہ ان کے پاس [illegible] کلیکشن۔ انگر کرسٹنسن، نیرا گوڈی، اوب اور گارسیا لورکا جیسے غیر ملکی شاعروں کی بھی بہترین کتابیں موجود تھیں اور اب یہ ساری کتابیں جو پاپا کی توجہ کی منتظر پڑی تھیں ان کو ہمہ وقت چھونے والی نظریں اب نہیں رہی تھیں۔ دل میں ہوک سی اٹھی تھی اور کرسی کی پشت پر رکھی میری انگلیاں کپکپا سی گئی تھیں۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

فاخرہ جبین

دوسری اور آخری قسط

یہ وہی اسٹڈی روم تھا جہاں میں نے اپنے ہر ایگزام کی تیاری پاپا کے ساتھ مل کر کی تھی۔ جہاں کسی بات کی سمجھ نہ آتی میں فوراً" پاپا کے پاس جا پہنچتی اور میرے بار بار ڈسٹرب کرنے کے باوجود کبھی ان کی تیوری پہ بل نہیں پڑتا تھا۔ کبھی ان کی مسکراہٹ بیزاری میں اور خوشدلی جھنجلاہٹ میں نہ بدلتی تھی۔
گزرا ہوا ایک ایک لمحہ ذہن میں ارتعاش پیدا کرنے لگا تھا اور میں غیر ارادی طور پہ ہر چیز کو چھو چھو کر پاپا کے گمشدہ لمس کو ڈھونڈنے لگی تھی۔
ان کا اسٹڈی ٹیبل ان کی چیئر۔
ان کا لیمپ۔
گولڈن فریم کا نہایت خوب صورت اور نفیس چشمہ۔
صندل کی لکڑی سے بنا قلم۔
اور۔
ان کی پرسنل ڈائری جو پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک خالی تھی۔ حالانکہ یہ ڈائری ہر روز میں ان کے سامنے کھلی دیکھتی تھی۔
"اور نہ جانے وہ کون سی باتیں تھیں پاپا جو آپ نوک قلم پہ لانے کی جرات نہ کر سکے۔"
میں نم آنکھوں کو رگڑ کر اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ کارپٹ پر کشن رکھ کر میں نے نشست سنبھالتے ہوئے دوبارہ پاپا کی مخصوص چیئر کی طرف دیکھا تھا جو کسی ماں کی اجڑی گود کی طرح خالی و ویران

لگ رہی تھی۔ شفقت و اپنائیت کے محبت بھرے
لمس سے عاری فضا میں سناٹا سا اتر آیا تھا اور میں نے
اپنی ناکام نظروں کو سفید کاغذ پہ بکھرے سیاہ لفظوں میں
گم کر لیا تھا۔
چونکہ بہت دنوں بعد کتابوں سے رشتہ جوڑا تھا اس
لیے ابتدا میں پڑھنے میں کافی دقت ہوئی تھی مگر جب
ذہن آمادہ ہوا تو پھر میں صفحات پلٹتی چلی گئی اور جب
ساڑھے تین گھنٹے مسلسل پڑھنے کے بعد میں نے
کتاب بند کی تھی تب ملازمہ دروازہ ناک کر کے اندر
چلی آئی تھی۔
"جی کھانا لگا دوں ٹیبل پر یا یہیں لے آؤں۔"
"کون کون ہے کھانے پر۔" میں نے ایک لمحہ سوچ
کر پوچھا تھا۔
"کوئی بھی نہیں اس وقت تو گھر میں آپ کے سوا
اور کوئی ہے ہی نہیں۔"
"ٹھیک ہے پھر ٹیبل پہ ہی لگا دو میں آ رہی ہوں۔"
میرے جواب پر اس نے تاسف سے مجھے دیکھا اور باہر
نکل گئی۔ اسے یقیناً" اس بات پر حیرت و افسوس ہوا
تھا کہ میں گھر والوں کی موجودگی میں ہمیشہ اپنے کمرے
میں کھانا کھاتی تھی اور اب سب کی غیر موجودگی میں
ٹیبل تک جا رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر ابھی میں نے
پہلا نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا جب اچانک بیرونی
دروازے میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ باتوں اور قہقہوں
کی آواز نے مجھے خاصا حیران کر ڈالا تھا۔ بے اختیار ہی
پلٹ کر میں نے آوازوں کی سمت دیکھا تھا اور جب
آنے والوں کو دیکھ کر میں سیدھی ہوئی تھی تو میرا منہ
حلق تک کڑوا ہو چکا تھا۔
"ہیلو شانزے ڈیئر۔" مما کی پرجوش آواز عقب
میں ابھری تھی۔ وہ دو ہفتے پشاور میں اپنی کسی دوست
کے پاس گزار کر آئی تھیں اور شاید ان کے خیال میں
میں ان کے بغیر بہت اداس ہو گئی تھی۔ جبھی تو بھرپور
لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے
ساتھ لگایا تھا مگر مجھے ان کے وجود سے ایسی وحشت
ہوئی تھی کہ میں نے فوراً" ہی خود کو ان کی گرفت سے
آزاد کروا لیا تھا۔ مما نے تحیر آمیز برہمی سے مجھے
دیکھا۔ میرے چہرے پہ رقم ناگواری کے تاثرات
یقیناً" انہوں نے بہت آسانی سے پڑھ لیے تھے مگر
احتشام احمد اور ولید احتشام کی موجودگی کی بناء پر وہ
میری اس بدتمیزی کو نظر انداز کر گئی تھیں اور فوراً"
ماسی نذیراں کو پکار کر کھانے کا کہنے لگی تھیں۔ اس
نے چند لمحوں میں ہی کھانا سرو کر دیا تھا۔ میرے عین
سامنے مما بیٹھ گئی تھیں ان کے دائیں طرف احتشام
احمد اور بائیں طرف ولید احتشام تھا۔ مما نجانے کون
سا قصہ شروع کیے بیٹھی تھیں وہ دونوں پوری طرح ان
کی طرف متوجہ تھے اور اس ٹرائی اینگل میں مجھے اپنا
آپ ایکدم نہایت فضول اور بہت ہی غیر اہم سا لگ
تھا۔ تب ہی مما کی نظر مجھ پہ پڑی تھی۔
"کیا بات ہے جانو تم ٹھیک طرح سے کھا کیوں
نہیں رہیں۔" وہ کچھ دیر پہلے کی بات کو مکمل طور پر نظر
انداز کر کے محبت کے اسی انداز میں بولی تھیں۔
"اور اگر یہ نظر ایک ماں کی ہوتی تو تب آپ یقیناً"
یہ دیکھ سکتیں کہ میں تو ٹھیک طرح سے سانس بھی
نہیں لے رہی۔"
میرے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا تھا۔ سو خاموشی سے
پانی پی کر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"شانزے بیٹا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔"
میں چلتے چلتے ٹھہر گئی تھی احتشام احمد کا لہجہ متفکر تھا
اور چہرے پہ بے پناہ نرمی۔
"شاید یہ شخص بہت بڑا اداکار ہے۔" میں نے
ایک لمحے کے لیے سوچا تھا اور ان تینوں کی سوالیہ
نظروں کو نظر انداز کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔
"یہ شانزے کو کیا ہوا ہے؟" احتشام احمد نے فوراً"
مما کو میری بجھی بجھی کیفیت کی طرف متوجہ کیا تھا۔
"ہونا کیا ہے ایمان حسن کی طرح اس کو بھی عادت
ہے ہر وقت بسورتے رہنے کی۔ خیر چھوڑیں آپ اس
کو یہ چکن لیں ہاں ولید میں کیا کہہ رہی تھی تم سے۔"
وہ دوبارہ سے اپنا قصہ لے بیٹھی تھیں اور میں
مرے مرے قدموں سے آخری سیڑھی بھی پار کر

تھی۔ بیڈ روم میں داخل ہونے سے پہلے میں نے یونہی
پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے کوئی بات کر
رہی تھیں۔ فانوس کی تیز روشنی میں ان کی سفید
رنگت دمک رہی تھی۔ چہرے پہ سرخی سی پھیل رہی
تھی۔ ڈارک لپ اسٹک سے مزین ہونٹ اور سفید
ہموار موتیوں جیسے دانت سفید لباس میں ان کا حسن
کس قدر مکمل تھا۔ روشن اور شاداب چہرے پہ
خوشیوں کا جھلملاتا عکس۔

"آپ تو آج بھی اتنی ہی خوشحال، اتنی ہی مطمئن
ہیں مما ایک طرف من پسند ہمسفر ہے تو دوسرے
طرف بیٹے کا مضبوط سہارا، محرومیاں تو صرف میرے
حصے میں آئی ہیں۔ سب کچھ چھین لیا آپ نے مجھ سے
باپ، دوست، دکھ شناس، ہر طرح سے تہی داماں کر دیا
آپ نے مجھے اور اس کے باوجود بھی آپ اتنی مطمئن و
پرسکون ہیں جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔" میں نے غور
سے ان کا چہرہ دیکھا جہاں دکھ کی کوئی ایک لکیر بھی ثبت
نہ تھی۔

"کیا پچھتاوے کے لہراتے، بل کھاتے سانپ نے
کبھی ان کے سینے پہ ڈنک نہیں مارا ہو گا۔؟
اور۔
کیا اتنے ڈھیر سارے دنوں میں کوئی ایسا لمحہ نہ آیا ہو
گا جو انہیں احساس زیاں سے دوچار کر گیا ہو؟
کوئی احساس جرم جس نے ان کی راتوں کی نیند اڑا
دی ہو۔
جتی رفاقتوں کا کوئی ایسا لمحہ جو یاد بن کر دل میں کھب
گیا ہو اور پھر ضبط کا کوئی یارا نہ رہا ہو۔
اپنے فعل پر کوئی دکھ، کوئی ندامت ـــــ جس نے
سانس لینا دوبھر کر دیا ہو میں نے ہر زاویئے سے ان کے
چہرے کو کھوجا تھا مگر وہاں بھولے سے بھی کوئی ایسا تاثر
نہ ابھر رہا تھا۔ وہاں تو خوشی تھی مسکراہٹ تھی روشنی
تھی۔

"تو گویا میرا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ اس عورت کے سینے
میں دل نام کی کوئی چیز نہیں۔" میرے بجھے بجھے دل میں
نفرت کی تیز لہر ایک بار پھر انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
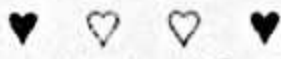
"دارالاطفال" کے سالانہ فنکشن کی تیاریاں
اپنے عروج پر تھیں۔ ہر فرد بڑے جوش و خروش سے
اس تقریب کو یادگار بنانے کی کوشش میں مصروف
تھا۔ رضا ہر روز ایک آدھ گھنٹے کے لیے آتا اور پھر رو
دھو کر واپس چلا جاتا کیونکہ اپنے بی ایس سی کے ایگزام
کی وجہ سے وہ ان تیاریوں میں بھرپور شرکت نہ کر پا رہا
تھا۔ اس روز بھی میں یونیورسٹی میں چند اہم کلاسز اٹینڈ
کرنے کے بعد دارالاطفال آئی تھی اور جب یہاں
سے باہر نکلی تھی کہ اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا۔

"اور آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے آفندی صاحب کو
گئے ہوئے۔" ریڈ سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے میں
نے سوچا تھا اور اس ایک ہفتے میں ہر روز آفس کے بند
دروازے کو میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر دیکھا
لاشعوری طور پر یہ خواہش دل میں ابھرتی رہی تھی کہ
آفس کا دروازہ لاک نہ ہو اور ہر دفعہ ہی یہ بند دروازہ
مجھے چڑا کر رکھ دیتا تھا۔

"اور اس اجنبی سرزمین، اجنبی لوگوں اور اجنبی

فضاؤں میں سانس لیتے اس شخص کے وہم و گمان میں
بھی نہیں ہوگا کہ اس لمحے کوئی اسے کتنا مس کر رہا
ہے۔ "گرین سگنل پر میں نے گاڑی آگے بڑھاتے
ہوئے وقت دیکھا۔ آج یونیورسٹی میں ونیزہ نے کوئی
گھنٹہ بھر میرے کان کھانے کے بعد مجھے اس بات پر
آمادہ کیا تھا کہ آج میں ڈنر ونیزہ اور حماد کے ساتھ کروں
گی "یار تم خوامخواہ مجھے کباب میں ہڈی بنوا رہی ہو۔"
میں نے جھلا کر اسے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر
اس کا کہنا تھا کہ حماد نے خاص طور پر یہ ڈنر میرے لیے
ارینج کیا ہے اس لیے کباب میں ہڈی والا محاورہ یہاں
درست نہیں بیٹھتا اور جب یہ ہی بات حماد نے فون پر
مجھ سے کہی تھی تو پھر میں انکار نہ کر سکی تھی۔
ونیزہ نے مجھے آٹھ بجے ہوٹل پہنچنے کا کہا تھا اور اس
میں ابھی پونا گھنٹہ باقی تھا۔ سو یہ پونا گھنٹہ میں نے بے
کار و بے مقصد گاڑی کو سڑکوں پہ دوڑاتے ہوئے گزارا
تھا۔ کیونکہ آج کل موسم میں وہ مخصوص نمی نہ تھی
اور نہ ہی آسمان پر گھنے بادلوں کا ڈیرہ تھا سو اس وقت
اطراف میں خوب رونق اور ہلچل تھی اور جب میری
کلائی پر بندھی گھڑی نے آٹھ بجنے پر اپنا مخصوص
الارم بجایا تھا تب میں نے گاڑی کا رخ موڑ دیا تھا۔
"فائیو ویز" کے پارکنگ ایریے میں گاڑی پارک کر کے
میں نیچے اتری تو عین اسی لمحے کوئی گاڑی میرے برابر آ
رکی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے یونہی
سرسری سی نظر ہنڈا سوک سے اترتے شخص پر ڈالی
تھی اور ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ سرسری
سی نظر ایک بھرپور اور گہری نگاہ میں بدل گئی تھی۔
حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات دل میں ہلچل سی
مچا گئے تھے۔
"اور کیا بے دھیانی میں کی گئی دعائیں یوں بھی
مستجاب ہوتی ہیں۔"
میں نے اپنا رخ پوری طرح اس کی طرف موڑ دیا
تھا اور اسے پکارنے کے لیے ابھی میرے لب وا ہی
ہوئے تھے جب اچانک اس کی طائرانہ نظریں مجھ سے
آملی تھیں اور ابھی میں مسکرا کر ہیلو بھی نہ کہہ پائی تھی
جب وہ نگاہیں اپنی تمام تر اجنبیت اور سرد و سپاٹ تاثر
سمیت میرے چہرے سے ہٹ گئی تھیں۔ میرے
پھیلے ہوئے ہونٹ ایک دم ہی سکڑ گئے تھے اور میں
ششدر سی اپنی جگہ پر کھڑی اس کی چوڑی پشت کو
دیکھتی رہ گئی تھی۔ حد درجہ بیگانگی کا مظاہرہ کرتے
ہوئے وہ غیر ملکی عورت کے ساتھ جا چکا تھا اور میں دم
بخودسی اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی اور ابھی میں
اس کے رویے کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی جب
اچانک کسی نے زور سے میرا بازو ہلایا۔ میں نے بری
طرح چونک کر دیکھا ونیزہ ہنستے مسکراتے چہرے سمیت
میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔
"کہاں گم ہیں محترمہ ہم لوگ آ چکے ہیں۔" اس
کے پیچھے حماد کو دیکھ کر میں نے بدقت تمام اپنے چہرے
پہ مسکراہٹ سجائی۔
"ہاں میں آپ ہی لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔"
"تو پھر جلدی چلو ناں۔۔۔ میرا تو سردی سے دم نکلا جا
رہا ہے۔" ونیزہ نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے
ہوئے کہا تو میں نے آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ مگر
چند قدم چلنے کے بعد میں ایک دم ٹھٹک کر رک گئی
تھی۔
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ کسی اور ہوٹل
میں چلیں۔" میں نے پلٹ کر ان دونوں سے کہا۔
"کسی اور ہوٹل میں۔۔۔ کیوں خیریت۔" حماد نے
حیران سے لہجے میں پوچھا۔
"ہاں خیریت ہی ہے مگر۔۔۔" میں الجھ سی گئی تھی۔
"میرا مطلب ہے۔۔۔ ڈنر ہی کرنا ہے تو کسی اور جگہ
سہی۔" میری اس بے تکی بات پر حماد نے حیرت سے
ونیزہ کو دیکھا تھا اور معلوم نہیں ونیزہ نے اسے اشارہ کیا
تھا یا حماد نے خود ہی اپنی حیرت پہ قابو پا لیا تھا اسی لیے
فوراً ہی خوشدلی سے اس نے کہہ دیا۔
"اوکے بھئی ایز یو وش بتاؤ کہاں جانا چاہو گی۔"
"میرا خیال ہے "شایان" میں چلتے ہیں وہ یہاں
سے کافی نزدیک ہے۔" میں نے لمحے بھر سوچنے کے
بعد کہا تھا اور وہ دونوں راضی برضا ایک مرتبہ پھر گاڑی
کی طرف بڑھ گئے تھے اور حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس
وقت بری طرح ڈسٹرب ہو چکی تھی اور اگر ان دونوں کا

خیال نہ ہوتا تو فوراً" یہاں سے بھاگ نکلتی۔ مگر اب صرف ان کی خاطر میں ذہن سے ہر خیال کو جھٹک کر خود کو نارمل کرنے لگی تھی اور "شایان ریسٹورنٹ" تک پہنچتے پہنچتے میں خود پر اس حد تک قابو پا چکی تھی کہ سردی سے بچنے کے لیے حماد کے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتی ونیزہ میرے جملوں پر بری طرح بلش ہوئی جا رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

دل جس کو دیکھنے کی تمنا میں گم میں رہا
کل یوں ملا تھا جیسے ہمیں جانتا نہیں

کتنا مختصر تھا وہ لمحہ جو ہم دونوں کے بیچ آیا تھا اور چپ چاپ سرک گیا تھا مگر اس کے باوجود دل کی بے کلی اس طرح سے بڑھی تھی کہ رات کے اس پہر بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ان سبز آنکھوں کو اپنے چہرے کو چھوتے اور پھر بے انتہا اجنبیت سمیت پلٹتے میں اس لمحے بھی محسوس کر رہی تھی اور جوں جوں ان سبز آنکھوں کا اجنبی تاثر میرے دل میں واضح ہو رہا تھا توں توں بے عزتی کا احساس دل میں بڑھتا جا رہا تھا۔ نہ دیکھنا اور بات تھی اور دیکھ کر اس طرح نظرانداز کر دینا مجھے کسی طرح ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"آخر کیوں کیا اس نے ایسا کیا میں اتنی ہی گئی گزری تھی کہ وہ مجھے ہیلو تک نہ کہہ سکتا تھا اور اس غیر ملکی عورت کے ساتھ چلتا بنا۔" میں نے بے چینی سے کمبل دور پھینکا اور اٹھ بیٹھی تھی۔ کتنا سوچا تھا میں نے اس شخص کے بارے میں پچھلے سات دنوں میں بے وجہ ہی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے
کاپی پہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے
دارالاطفال کے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے
کسی مستحق فرد کو سو سو کے کئی نوٹ تھماتے ہوئے
کسی بچے کے آنسو صاف کرتے ہوئے

اس کا سحر انگیز سراپا جیسے زبردستی آنکھوں میں گھسا چلا آیا تھا اور آج جب مجسم میرے سامنے آیا تھا تو اس کا گریز مجھے خود سے بھی شرمندہ کر گیا تھا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس عورت کے سامنے مجھ سے مخاطب نہ ہونا چاہتا ہو۔" دل نے توجیہ پیش کی تھی اور مجھے وہ عورت یاد آ گئی تھی جس کی چال میں بہت تیزی اور بے باک سا اعتماد تھا۔

"مگر میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں جس کی دوسروں کے سامنے تشہیر کرنا ممکن نہ ہو کون نہیں جانتا کہ وہ "دارالاطفال" جیسے ادارے کا مالک جمشید آفندی ہے اور جس ادارے میں بیسیوں ورکرز اس کے تحت کام کرتے ہوں وہاں کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ کوئی ورکر اس سے ٹکرا سکتا ہے۔ پھر مسکرا کر وش کرنے میں آخر حرج ہی کیا تھا۔"

سیاہ آسمان پہ نظریں دوڑاتے ہوئے میں نے الجھ کر سوچا تھا مگر بہت کوشش کے بعد بھی کوئی سرا میرے ہاتھ میں نہ آیا تھا۔ حتیٰ کہ کھڑکی سے آتی سرد سرسراتی ہوا سے میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔ تب میں کھڑکی بند کر کے دوبارہ بستر پہ آ گئی تھی اور سونے سے ایک لمحہ قبل تک وہ سبز اجنبی آنکھیں میرے دماغ میں گھومتی رہی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات دیر سے سونے کے باوجود صبح میری آنکھ جلد ہی کھل گئی تھی۔ یونیورسٹی بند تھی اور میں کوشش کے باوجود خود کو "دارالاطفال" جانے پر آمادہ نہیں کر سکی تھی اور اس وقت میں تنہا بیٹھی ناشتا کر رہی تھی جب احتشام احمد جاگنگ سے واپس آئے تھے۔ میری یہاں موجودگی پر وہ ٹھٹکے تو ضرور ہوں گے کیونکہ اس وقت تک میں اپنی گاڑی سمیت گھر سے نکل گئی ہوتی تھی یا پھر اپنے بیڈ روم میں ابھی تک بستر پہ پڑی ہوتی تھی۔ بہرحال وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور جب وہ سوٹڈ بوٹڈ آفس جانے کے لیے کمرے سے باہر آئے تو ٹی وی لاؤنج میں میرے پاس آ کر قدرے رک سے گئے تھے۔

"شانزے بیٹا... بہت دنوں بعد گھر میں دیکھا ہے تمہیں اور بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے اگر فارغ ہو تو چلو آج اپنے آفس کا چکر لگا لو۔"

"نو تھینکس۔" ان کے نرم لہجے کے جواب

میں، میں نے قدرے رکھائی سے کہہ کر ٹی وی پہ نظریں جمادی تھیں۔

"اوکے انجوائے یور سیلف۔" انہوں نے ہولے سے میرا سر تھپتھپایا تھا اور پلٹ گئے تھے جبکہ میں دل ہی دل میں تاؤ کھا کر رہ گئی تھی۔ ٹی وی پہ متحرک تصویریں بور کرنے لگیں تو میں اٹھ کر باہر لان میں آ گئی۔ موسم سرما کی نرم گرم، معصوم اور البڑی دھوپ لان کی دیواروں سے اتر کے گھاس پہ آ ٹھہری تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پرندوں کے پنجرے کے پاس آ گئی۔ موسم کی شدت سے بے زار آسٹریلین پیرٹ دھوپ میں پر پھیلائے جیسے اپنے وجود میں جمی برفاب ٹھنڈک کو پگھلا رہے تھے اور خاصے پرجوش نظر آ رہے تھے۔ چائنیز ڈوبروں کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے رقص میں مصروف تھی۔ اور ابھی میں نجانے کتنی دیر تک ان کی حرکتوں سے محظوظ ہوتی کہ ملازم نے کارڈلیس میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ دوسری طرف عاصم تھا جو اپنے مخصوص پر تکلف مگر اپنائیت بھرے انداز میں مجھے آج شام میں ہونے والی میٹنگ کی اطلاع دے رہا تھا۔

"آفندی صاحب آ چکے ہیں' انہوں نے ہی میٹنگ کال کی ہے۔" وہ بتا رہا تھا۔

"پھر آپ پہنچ رہی ہیں شام کو؟" اس کے پوچھنے پر میں کسی خیال سے چونکی۔

"ہاں آؤں گی۔" میں نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا تھا اور پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

"شام کو میں مقررہ وقت پر ہی "دارالاطفال" پہنچی تھی۔ اور اس وقت میٹنگ روم میں رضا اپنے مخصوص لاابالی انداز میں "چیٹنگ" کے آزمودہ نسخے مجھے ازبر کروا رہا تھا۔ جب میٹنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور پہلے جمشید آفندی اور اس کے بعد عاصم کا چہرہ نظر آیا تھا۔ اپنی نشست سنبھالتے ہوئے اس نے بڑے سادہ سے لہجے میں سب لوگوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا تھا اور اس کے بعد آئندہ چند دنوں میں ہونے والی تقریب کے متعلق بات شروع کی تھی۔ میں نے یونہی میز کی سطح سے نظریں اٹھا کر سب کے چہروں کو دیکھنا شروع کیا۔ ہر کوئی بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں نظریں اس کے چہرے پہ گاڑ دی تھیں اور دوسرے معنوں میں اجنبیت و بیگانگی کے اس تاثر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جس سے کل مجھے سابقہ پڑا تھا۔ مگر اس وقت ایسا کوئی تاثر مجھے دیکھنے کو نہ ملا تھا۔ وہ اپنی بات میں پوری طرح محو و مگن تھا۔ میٹنگ ہال میں اس کی آواز گونج رہی تھی اور باقی سب لوگ جیسے مٹی کے مادھو بنے اپنی نظریں اور سماعتیں اس پر گاڑے بیٹھے تھے۔

"اس کی شخصیت میں کوئی ایسا سحر ہے ضرور جو دوسروں کو مبہوت کر دیتا ہے۔"

میں نے اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا اور میں اپنی انہی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسی وقت چونکی جب میٹنگ کے اختتام پر رحمہ نے مجھے ٹھوکا دیا تھا۔ میٹنگ کے بعد ڈنر کا پروگرام تھا اور موڈ نہ ہونے کے باعث میں ضروری کام کا بہانہ کرتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے جرسی کی جیبیں ٹٹول کر چابی ڈھونڈنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ناکامی کے بعد میں نے اپنا شولڈر بیگ کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔

"اوہ کہاں چلی گئی۔" میں نے جھنجھلا کر بیگ کی ساری چیزیں الٹ دیں مگر چابی یہاں سے بھی برآمد نہ ہوئی تھی۔ میں نے پلٹ کر ادھر دیکھا جہاں سے میں آئی تھی اور اب وہاں اچھی خاصی محفل جم چکی تھی۔ دوبارہ جا کر چابی کی تلاش میں سب کو ڈسٹرب کرنا مجھے بہت آکورڈ لگا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ کچھ زیادہ وقت نہیں ہوا تھا اس لیے کوئی بھی سواری آسانی سے مل سکتی تھی اس لیے میں یونہی گیٹ سے باہر آ گئی تھی۔ اس روڈ پہ کوئی خاص رش نہیں تھا۔ اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا سائیکل سوار بھی پاس سے گزر جاتا تھا۔ آسمان پہ پورا چاند اس حد تک روشن اور قریب محسوس ہو رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر چھو لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ بالوں سے اٹھکھیلیاں کرتی

سرد ہوا کپکپاہٹ کے باوجود بہت اچھی لگ رہی تھی۔
میں نے آنکھوں کے پپوٹے ایک لمحے کے لیے بند کر کے ان کی ساری ٹھنڈک کو اپنے اندر جذب کیا اور ہاتھوں کی سرد پوروں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ تبھی کوئی پتھر پاؤں کی ٹھوکر کی زد میں آیا تو میرے سامنے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں بے ساختہ ہی ہنس دی تھی۔ اور پھر اس پتھر کو لگنے والی دوسری اور تیسری ٹھوکر شعوری تھی۔

میرے دل تو ہے مسافر
زندگی اک سفر ہے

دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے ایک لمحے کو میرا دل چاہا میں پوری قوت سے گلا پھاڑ کر گانے لگوں اور اپنے اس خیال پہ میں خود ہی زور سے ہنس دی تھی۔
"لگتا ہے کسی دیوانی کی روح مجھ میں آسمائی ہے۔ جو اس سرد اور جامد سناٹے سے پوری طرح محفوظ ہونا چاہتی ہے۔" میں خود سے مخاطب ہوئی تھی۔
تبھی پاس سے گزرتے سائیکل سوار نے غالباً میری بڑبڑاہٹ سن کر پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا۔
"اے بھائی مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" میں نے اسے پکارا۔ وہ کوئی نو عمر لڑکا تھا۔ میرے کہنے پر اس کی آنکھیں تحیر آمیز خوف سے پھیل گئی تھیں۔ اسٹریٹ لائیٹ کی زرد روشنی میں اس کے چہرے پہ واضح بوکھلاہٹ مجھے نظر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے آگے کو جھک کر زوردار پاؤں پیڈل پہ مارے اور چند لمحوں میں ہی یہ جا وہ جا' میں نے مسکراتے ہوئے ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے زیادہ سردی میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ تبھی ایک گاڑی میرے بالکل نزدیک آکر رکی تھی اور ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ میں نے چوکنا نظروں سے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص کو دیکھا اور پھر کچھ لمحے سوچ میں پڑ گئی۔
"آیئے مس شانزے۔" اس کے پکارنے پر میں نے دائیں بائیں دیکھا اور کسی سواری کو نہ پا کر میں گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔
"آپ بعض اوقات بہت بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہیں مس شانزے۔" میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے پوری سنجیدگی سے کہہ ڈالا تھا۔
"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"اس وقت یوں سڑک کے کنارے ٹہلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میری جگہ اگر کوئی غنڈہ' کوئی اوباش انسان ہوتا تو۔۔۔؟"
میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ سبز آنکھوں میں برہمی تھی اور لہجے میں غصے کی آمیزش۔ نجانے کیوں میں بے اختیار ہنس دی تھی۔
"کمال ہے آفندی صاحب کہاں تو آپ ہمیں پہچان نہیں پائے اور کہاں ہماری حفاظت کے لیے اتنا تردد بائے داوے آفندی صاحب آپ ہمیں دیکھ نہیں پائے تھے یا پھر دیکھ کر پہچان نہ سکے تھے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ مگر جواباً وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ ہونٹ بھینچے خاموشی سے اسٹیئرنگ گھماتا رہا تھا اور جب وہ بولا تھا تو لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔
"بعض اوقات یوں ہوتا ہے مس شانزے ایمان کہ لمحے انسان کی دسترس میں نہیں رہتے بلکہ انسان لمحوں کی دسترس میں چلا جاتا ہے اور پھر اس کی ہر حرکت ان لمحوں کے تابع ہو جاتی ہے وہ اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔
مجھے معلوم ہے آپ میرے کل کے رویئے پر ناراض ہیں اپنا نظر انداز کیا جانا آپ کو بے حد گراں گزرا ہو گا مگر بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اس وقت میں بھی کسی ایسے ہی لمحے کی زد میں تھا۔"
اس کا لہجہ بہت بکھرا ہوا تھا اور بے تحاشا جگمگاتی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کے لفظوں پہ غور کرنے کے باوجود بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر اسے مضمحل سا دیکھ کر میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ نجانے کتنی دیر تک خاموشی کی دیوار ہم دونوں کے مابین کھڑی رہی۔ اپنے اپنے خیالات میں ہم اس طرح غرق تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا کب گاڑی "شانزے ولا" کے سامنے جا رکی۔

"مس شاہزے چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں خوش رہا کریں۔" میں گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک سی گئی۔ میں نے یونہی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ پہ جمی تھیں۔ اس کے چہرے پہ ایک یاسیت بھری اداسی تھی۔

"آفندی صاحب آپ گھر نہیں چلیں گے؟" میں نے اسے اپنی جگہ جمے دیکھ کر پوچھا تو وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکا تھا۔ نظروں کا زاویہ بدل کر اس نے ایک نظر پرشکوہ "شاہزے ولا" کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں اب چلوں گا۔" اس کے کہنے پر میں گاڑی سے اتر آئی تھی اور میرے دیکھتے ہی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی مگر اس کے وجود سے پھوٹتی مخصوص مردانہ پرفیوم کی خوشبو نے بیڈ روم تک میرا پیچھا کیا تھا۔

"کتنی اپنائیت تھی اس شخص کے قرب میں۔" میں نے بیڈ پر گرتے ہوئے سوچا۔

"نظریں ملیں تو لگتا ہے ہم دونوں کے بیچ کبھی کوئی فاصلہ ہے ہی نہیں۔

خاموش رہوں تو لگتا ہے یہ شخص زینہ بہ زینہ میری ذات میں اترتا جا رہا ہے۔

بولنے لگوں تو لگتا ہے سب کچھ پہلے سے ہی جانتا ہے۔

ولایت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر ولی سے کم بھی نہیں۔ ویسا ہی پاکیزہ و کانچ کی طرح شفاف فرشتوں کی طرح معصوم اندر سے بھی ویسا ہی خوب صورت جیسا باہر سے، دوسروں کے آنسو مقدس موتیوں کی طرح اپنے دل کی سیپ میں بند کر لینے والا مگر معلوم نہیں اپنی ذات میں کیسے اسرار لیے پھرتا ہے وہ اور آج اس کے چہرے پہ کیسی حسرت تھی مگر صرف لمحہ بھر کے لیے کبھی کبھار تو مجھے اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ نظر آتے ہیں مگر وہ بھی گھڑی بھر میں معدوم ہو جاتا ہے اور تو لگتا ہے اس کی چٹان جیسی مضبوط شخصیت کے پیچھے ایک اور ہی جہاں آباد ہو گا جس کے اندر جھانکنے کی جرات آج تک کوئی کر ہی نہ سکا ہو گا۔"

اس رات میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور سونے سے ایک لمحہ قبل تک میرے آس پاس ایک ہی جملے کی گردان ہوتی رہی تھی کہ۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں خوش رہا کریں۔"

♥ ♡ ♡ ♥
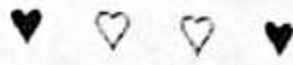
بادلو! دھند کے مانند بکھرنا سیکھو
اک ردا بن کے بکھر جاؤ میری دنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں' زر و سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک کو بھی محسوس نہ ہو
ہمسفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زر و سیم کی تقسیم کا یہ جرم' فریب
میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ' اتر آؤ میری دنیا پر

لیلیٰ سفید لباس میں کوئی ماورائی مخلوق لگ رہی تھی۔ چہرے پہ حزن و ملال کا تاثر تھا اور لہجے میں نمی نے نظم کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ ہال میں سکوت سا چھا گیا تھا اور میں دونوں ہاتھ دعا کے سے انداز میں سینے پر رکھے گویا سانس روکے کھڑی تھی۔ بصارت سے محروم یہ پیاری سی لیلیٰ بے حد حساس اور زود رنج بھی تھی اور اس نے کتنا کہا تھا۔

"آئی کانٹ ڈو دیٹ شاہزے۔" وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

"آئی ایم شیور لیلیٰ جانو یو کین ڈو دیٹ۔" میں نے اسے پوری طرح تسلی دی تھی اور اب اس نے اتنے خوب صورت انداز میں یہ نظم پڑھی تھی کہ جب وہ اس کے اختتام پر اسٹیج سے اتری تھی تو ہال میں بہت دیر تک تالیوں کا شور رہا تھا۔ خود میرے ہاتھ تالیاں پیٹ پیٹ کر سرخ ہو گئے تھے۔

"ویلڈن لیلیٰ۔" اس کے قریب آنے پر میں نے

بے اختیار اس کا منہ چوم لیا تھا لوگوں کے ستائشی کلمات پر جیسے میری ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں خود بھی کافی پریشان تھی۔ وہ پہلی مرتبہ اسٹیج پر گئی تھی ایسی صورت میں اگر وہ کوئی گڑبڑ کر دیتی تو سارا امپریشن خراب ہو جاتا تھا۔

آج "دارالاطفال" کا سالانہ فنکشن تھا اور اس کی تیاری کے لیے ہم لوگوں نے دن رات ایک کر رکھا تھا۔ دیگر سماجی اداروں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا کچھ پریس کے نمائندے بھی موجود تھے۔ سارا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بچے رنگ برنگے کپڑے پہنے تتلیوں کی مانند ادھر سے ادھر جھومتے پھر رہے تھے۔

لیلیٰ کی نظم سے اس تقریب کا اختتام ہو گیا تھا اور اب کچھ معززین اسٹیج پر آکر ادارے کی اس کاوش کو سراہ رہے تھے۔ میری نظریں بے اختیار ہی اس شخص کو کھوجنے لگی تھیں جس کی بدولت یہ سب ممکن ہوا تھا اور پھر پہلی رو کی تیسری کرسی پر جا کر میری نظریں ٹھہری گئی تھیں۔ سیاہ پینٹ کوٹ میں اس کا وجیہہ و دلکش سراپا کس قدر نمایاں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ مکمل سنجیدگی طاری تھی اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے بہت دھیان سے اس کے چہرے پہ خوشی کی وہ رمق تلاش کرنی چاہی جو آج کے اس کامیاب فنکشن کے اختتام پر ہونی چاہیے تھی مگر وہاں اس خوشی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"آخر کیوں؟" میں نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ بند منجمی ہونٹوں پر جمائے وہ کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ میں الجھ کر رہ گئی تھی اور جب عاصم نے الوداعی کلمات کے لیے اسے اسٹیج پر پکارا تھا تو وہ ایک دم چونک گیا تھا۔

"گویا یہ ذہنی طور پر یہاں موجود ہی نہ تھا۔" میں نے اسے مضبوط قدموں سے ڈائس کی طرف جاتے دیکھا۔

اس کا سر کچھ لمحوں کے لیے جھکا رہا تھا پھر اس نے ڈائس پہ دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے پورے ہال پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی۔ اس کی مقناطیسی شخصیت کا سحر پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لیے رہا تھا۔ ہر طرف ایک گمبھیر سی خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے بہت شستہ لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا تو اسے سننے کے لیے میری دھڑکنیں تک تھم گئی تھیں۔

بچے بڑی محبت سے اپنے آفندی پاپا کو دیکھ رہے تھے اور باقی سب لوگ اس عظیم انسان کو اپنی توصیفی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھے جس نے ان پھولوں کی آبیاری کے لیے دن، رات کا فرق مٹا دیا تھا۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھی ایک ٹک اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ نجانے کیوں وہ پہلے سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرا اطمینان و سکون سے عاری تھا۔ اس کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی مگر میں اس کے الفاظ سن نہیں پا رہی تھی۔ میں تو اسے صرف دیکھ رہی تھی۔ آج وہ بہت مضطرب تھا، بہت بے چین، مگر کیوں؟ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ مضطربانہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو بار بار کھول رہا تھا، بند کر رہا تھا۔ اس کے جاندار لہجے میں تھکن پنہاں تھی اس کے چہرے کے تنے تنے مغرور نقوش میں کوئی دکھ اتر رہا تھا۔ اس کی سبز جھیلوں جیسی آنکھوں میں سمندروں کی سی نمی تھی۔

اس کے عنابی ہونٹوں کو جیسے کبھی مسکراہٹ نے چھوا تک نہ تھا اور ہونٹوں کے بالکل برابر وہ سہا ہوا سیاہ تل۔

مجھے لگا میں اس شخص کے بہت قریب جا چکی ہوں اور شاید اس کے وجود کی گہرائیوں میں اتر جانے والی ہوں اس کی چٹان جیسی شخصیت کی دراڑیں مجھ پر کھلنے والی ہیں مگر عین اسی لمحے کسی نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔

"کہاں کھو گئی ہو؟ میں کب سے تمہیں بلا رہی ہوں۔" یہ شہزینہ تھی۔ میں گہری سانس لے کر اس کی طرف پلٹی اور تب ہال سے باہر نکلتے لوگوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اب سے پہلے جو چند لمحے گزرے ہیں ان میں، میرے اور اس شخص کے علاوہ اور کوئی نہ

تھا۔
سب مہمان ریفریشمنٹ کے لیے باہر جا چکے تھے اور ریفریشمنٹ کے دوران رضا کی بے تکی حرکات اور زوار شاہ کے نپے تلے جملے بھی مجھے متاثر نہ کر سکے تھے۔ ذہنی رو بھٹک بھٹک کر اس شخص تک جا رہی تھی جس کے سامنے کافی کا مگ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دیگر لوازمات سے بھری پلیٹ بھی جوں کی توں پڑی تھی۔ تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ملازمین تمام چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ کافی کا آخری گھونٹ لے کر خالی مگ میز پہ رکھ کر میں بے اختیار ہی اس طرف بڑھ گئی تھی۔

"آفندی صاحب۔" میں نے انگلیوں سے ٹیبل بجاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکا تھا۔

"شانزے....." اس نے سر اٹھا کر مدد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"میرے ساتھ چلو گی۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کہاں" اور "کیوں" جیسے سوالات میرے لبوں پر آکے دم توڑ گئے تھے۔ اثبات میں سر ہلا کر میں اس کے ساتھ چل دی تھی۔ وہ اس وقت کسی بچے کی طرح مضطرب دکھائی دے رہا تھا اور جب اس نے گاڑی ایک قطعی غیر معروف انجان ویران سڑک کی طرف موڑی تو آج کا سورج سڑک کے کنارے پر اپنی الوداعی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے اس خاموش اور ساکت وجود کو دیکھا۔

اس زرد شام کی تمام تر اداسی ان آنکھوں میں سمٹ آئی تھی.. یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہے۔

"کم از کم مجھے تو معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ ہم اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔"

اس سنسان سڑک پر آکے میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا۔ گاڑی جو پہلے فل اسپیڈ پر بھاگی جا رہی تھی قدرے آہستہ ہو گئی تھی اور پھر سڑک کے دائیں طرف جا کر رک گئی تھی۔ میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ ارد گرد کوئی جگہ بھی تو ایسی نہ تھی جسے مطلوبہ مقام سمجھ کر گاڑی روک دی گئی تھی۔

"شانزے تم نے کبھی مستان شاہ کو دیکھا ہے؟" آدھے گھنٹے کی اس مسافت میں وہ پہلی بار گویا ہوا تھا۔

"مستان شاہ۔" میں نے زیر لب نام دہرایا۔

میں نے تو یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا تھا۔ اس لیے دیکھنے یا ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہاں کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا اسے صرف میں نے دیکھا ہے صرف میں ملا ہوں اس سے اور شانزے میں تو اب بھی ہر روز اس سے ملتا ہوں۔ اس صدیوں پرانے درخت کے نیچے۔"

وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بول رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اس درخت کو دیکھا۔ انتہائی قدیم ترین درخت تھا اور اس قدر گھنا کہ اس کے آس پاس کی زمین پر سورج کی کوئی ایک کرن بھی نظر نہ آرہی تھی۔

"میں اس سے ملنے ہر روز یہاں تک آتا ہوں اور معلوم ہے اگر میں نہ آسکوں تو پھر وہ مجھ سے ملنے چلا آتا ہے خواہ اس وقت میں کہیں بھی ہوں۔ اس ملک سے باہر ہوں یا اس خطے سے 'دن ہو یا رات' میں سو رہا ہوں یا کام میں مشغول وہ خود بخود مجھ تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ لوگ کہتے ہیں آج سے اٹھائیس سال قبل وہ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے مر گیا تھا۔ اسی صدیوں پرانے درخت کے نیچے۔"

میں نے حیرت سے اچھل کر اسے دیکھا کیسی عجیب بات کہہ رہا تھا وہ۔

"اور مجھے تو اس کے گھنگھروؤں تک کی آواز سنائی دیتی ہے اس کے آنے سے پہلے اور اس کے جانے کے بعد بھی پھر لوگ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مستان شاہ اٹھائیس سال پہلے مر چکا ہے۔" اس نے نڈھال ہو کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی شگفتگی تھی۔

"اور میں تو اسے اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔" وہ مجھ سے زیادہ خود سے مخاطب تھا۔

"اس کے گھنگھروؤں کی آواز مجھے بخوبی سنائی دے رہی ہے تم دیکھ رہی ہو ناں شانزے؟ وہ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔"
میں نے ایک بار پھر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اور ان کی جڑوں میں گھاس اتنی لمبی اگی ہوئی تھی کہ ایک انسان اپنے پورے قد کے ساتھ اس میں سما سکتا تھا۔ عین سامنے یہ پتلی سی سڑک بہت دور تک جا کر درختوں کے جھنڈ میں گم ہوتی دکھائی دے رہی تھی پھر ریل کی پٹڑی..... میں نے الجھ کر اس کی سمت دیکھا مگر وہ تو شاید بند آنکھوں سمیت سب کچھ دیکھ رہا تھا۔
"وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا ہے.... اس کے لمبے بال لٹوں کی صورت اس کے گلے میں جھول رہے ہیں۔ اس کے لبادے پر رنگ برنگے پیوند ہیں اور پاؤں میں بھاری گھنگھرو اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہے جسے وہ متواتر زمین پہ مارتا چلا آ رہا ہے اور تم دیکھ رہی ہو اس کے پیچھے ایک بچہ چلا آ رہا ہے، بمشکل سات آٹھ سال کا بچہ پٹڑی کے آس پاس بکھرے پتھر اس کے ننگے پاؤں میں مسلسل چبھ رہے ہیں۔ وہ بھاگ بھاگ کر مستان شاہ کے بڑے بڑے اٹھتے قدموں کا ساتھ دینے میں ہلکان ہوا جا رہا ہے اور اب وہ لوگ درختوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر مڑ رہے ہیں۔"
میں حیرت کے مارے بے ہوش ہونے کو تھی۔ وہ خود میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اسے پکارنے تک کی ہمت نہ کر سکی تھی۔
"اب وہ لوگ پگڈنڈی کے خاتمے پر اس سڑک کے کنارے نمودار ہو رہے ہیں۔ مستان شاہ کے قدموں میں تیزی آ گئی ہے اب وہ اس صدیوں پرانے درخت کے نیچے بنے چبوترے پر کھڑا ہے اس کے پاؤں ایک مخصوص تال سے زمین پر پڑ رہے ہیں وہ گول گول گھوم رہا ہے اور ایک لے میں گا رہا ہے۔"

تا الکھ جگا سنسار میں جب ماں کی کوکھ ہنی
تا پتنگ کھولی باپ نے جب میری ناف کٹی
تا عمل کیا رمال نے تا دھن خیرات بٹی
تا برہوں نے منتر تان کے کوئی پاک زبان رٹی
میں آپ ہوں اپنا زائچہ، میں آپ ستارا ہوں
میں آپ سمندر ذات کا، میں آپ کنارا ہوں

میں ششدر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس شخص کو جھنجھوڑ ڈالوں یا خود یہاں سے بھاگ نکلوں پراسرار ماحول اور اس کا ناقابل فہم رویہ مجھے بری طرح خوفزدہ کر رہا تھا۔ مگر وہ تو جیسے آپ میں ہی نہیں تھا۔ رواں لہجے میں وہ آنکھیں بند کیے کہے جا رہا تھا۔

اودھرتی کھول ہتھیلیاں میں پاؤں سے کھینچوں ریکھ
میرے کٹے پھٹے پاپوش ہیں پر نقش نگاری دیکھ
میں کنڈلی ہوں تاریخ کی میں جنم جنم کا لیکھ
میں بانجھ زمیں کا سنبلہ میں زرد رتوں کا میکھ
اک خیرہ خیرہ روشنی میری چھاؤں میں ہوتی ہے
یہ دنیا جس کا نام ہے میرے پاؤں میں ہوتی ہے

"اور دیکھو وہ کوئی تھکا ہارا مسافر چلا آ رہا ہے۔ وہ مستان شاہ کے ہونٹوں سے ادا ہوتے لفظوں پر جھوم رہا ہے اور اب اس نے اپنی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا تھا۔ اس کی جیب کا واحد، آخری نوٹ، مستان شاہ کے پاس کھڑے بچے کے ہاتھ میں ایک کشکول ہے اور وہ نوٹ اس کشکول میں منتقل ہو چکا ہے۔ بچے کی آنکھ جھک گئی ہے اور ماتھے پہ پسینے کے چند قطرے ہیں۔
مستان شاہ کی دھیمی پڑتی تان، پچاس کا نوٹ دیکھ کر پھر سے بلند ہونے لگی ہے اب وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش سے گھوم رہا ہے اس کے قدموں کی دھمک سے زمین بھی لرزنے لگی ہے۔ گھنگھروؤں کی آواز پر اس ویرانے کی ہر چیز جھومنے لگی ہے۔

او مانگ بھری میری کامنی! میرے ساتھ جوانی چکھ
یہ جگ تیری جاگیر ہے، تو کھل کے پاؤں رکھ
اس ورق ورق سنسار کو تو کھول کھول پرکھ

جیون نقش الکھ
رہیں سدا یہ دشت نور دیاں ہے
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں آ ہوا ہتھیلی پہ
آ اسم سم سم پھونک دیں اس جنم پہیلی پہ
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں، آ ہوا ہتھیلی پہ
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں، آ ہوا ہتھیلی پہ
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں، آ ہوا ہتھیلی پہ

اس جملے کی تکرار ہونے لگی تھی اور مجھے یہ آواز اپنے چہار جانب سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں سانس روکے اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی تھی۔ میری آنکھ گویا پتھرا گئی تھی۔ عجب عالم بے یقینی تھا۔ میں پوری کی پوری اس شخص کی طرف گھوم گئی تھی جو عالم بے خودی میں ایک ہی جملے کی تکرار کیے جارہا تھا۔

آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں
آ ہوا ہتھیلی پہ

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر اس سختی سے جمے ہوئے تھے کہ سبز رگیں ہاتھوں سے باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ چہرے پہ عجیب وحشت طاری تھی اور تنفس تیز تر ہوتا جارہا تھا۔ اس سردی میں چہرے پہ پسینہ بہہ رہا تھا اور کنپٹی کی رگیں تن کر ابھر آئی تھیں اس کی از حد خراب حالت پر میں نے متوحش ہو کر اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"آفندی صاحب کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

میرے ایک دم جھنجھوڑنے پر اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور وہ یوں متحیر و متعجب مجھ پہ نظریں گاڑے بیٹھا تھا کہ میں گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

"آر یو آل رائیٹ آفندی صاحب" میں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا اور اس کے بازو پہ رکھا ہاتھ آہستگی سے ہٹا لیا۔ درحقیقت اس کی کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ ابھی تک بے یقینی سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ گویا وہ میرے وجود سے بالکل بے خبر تھا اور اتنی دیر سے وہ مجھ سے نہیں خود سے مخاطب تھا۔ اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور گاڑی کی چھت پہ بازو رکھ کر اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

میں نے اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟"
"ابھی جو آفندی صاحب نے کہا وہ کیا تھا؟"
"اور مستان شاہ کون ہے؟"

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پر ختم، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا زمین جیسے خلا میں قلابازیاں لگا رہا تھا۔ نجانے کتنے لمحے یونہی بیت گئے تھے۔

تب گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز پر میں نے سر اٹھایا۔ اس نے موڑ کاٹ کر گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا چہرے کی غائیت درجہ سرد مہری نے مجھے کچھ نہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے گویا کبھی جدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ لاشعوری طور پر اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اندر ہی اندر الجھتی رہی تھی اور اسی الجھن، پریشانی و تفکر میں مجھے معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ کب گاڑی ان ویران رستوں سے نکل کر شہر کی ہنگامہ خیز سڑکوں پر دوڑنے لگی تھی اور جب "شانزے ولا" کے سامنے گاڑی کے پہیے چرچرائے تب میں بری طرح چونک گئی تھی۔

دروازہ کھولتے ہوئے میں نے مڑ کر ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا وہ رخ موڑے کھڑکی کے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں اسی خاموشی سے گاڑی سے اتر آئی تھی اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح میری آنکھ کھلی تو ملگجا سا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی کسلمندی سے بازوؤں میں سر دیئے لیٹی رہی۔ رات بھر عجیب و غریب چہرے خواب میں آ آکر مجھے ڈراتے رہے تھے۔ کبھی غنودگی میں گھنگھروؤں کی آواز سنائی دیتی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی پھر ذرا نیند کا غلبہ ہوتا تو چہار جانب سے ایک ہی لے

ے میں مختلف آوازیں سنائی دیتی رہیں۔
او بانگ بھری میری کامنی
تیا وس پہ مٹی باندھ لیں
تھوا انجھیلی پہ

اور نجانے کون کون سے فقرے مستقل مجھے ڈسٹرب کرتے رہے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس وقت سر میں شدید درد ہونے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں ادھوری نیند کی کڑواہٹ بھی بھری ہوئی تھی۔ بھاری پپوٹوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے میں نے وقت دیکھا اور پھر انٹرکام پر ملازمہ کو چائے لانے کی ہدایت کرتے ہوئے میں بستر سے اٹھ گئی تھی۔

بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے میں گلاس ونڈو تک آئی تو تب مجھے احساس ہوا کہ رات بھر کھڑکیوں پہ ہونے والی دستک جو مجھے خوفزدہ کرتی رہی وہ دراصل یہ اس بارش کی شرارت تھی جو اس وقت بھی بہت باریک اور نرم پھوار کی صورت زمین پہ گر رہی تھی۔ آسمان پہ گھرے سیاہ بادلوں نے جانے کب قبضہ جمایا تھا اور اب بڑی مستقل مزاجی سے روشنی کے دیوتا کو پابند کیے ہوئے تھے کہ آٹھ بجنے کے باوجود بھرپور اجالا نظروں سے اوجھل تھا۔

میں دروازہ کھول کر ٹیرس پہ چلی آئی۔ خنک ہوا نے بڑی دیدہ دلیری سے مجھے اپنی بانہوں میں قید کر لیا تھا۔ ماحول کی ہر چیز اس وقت ایک عجیب سے سکوت میں ڈھکی ہوئی تھی۔ بارش کی کِن مِن کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ چشم برگ سے بارش کے قطرے آنسوؤں کی صورت ٹوٹ کر گرتے تو سبز گھاس بڑے شوق سے اس قطرہ آب کو اپنی زلفوں میں سجا لیتی۔ میں نے ذرا سا آگے کو جھک کر دیکھا اردگرد کے گھروں میں بھی ہر روز کی چہل پہل نہ تھی۔ گویا جاتے جاتے موسم نے پلٹ کر ایک مرتبہ پھر لوگوں کو ان کے گھروں میں مصلوب کر دیا تھا۔

تبھی ایک سفید گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے یونہی ٹیرس کی گرل پہ جھکے جھکے گاڑی کے اندر بیٹھے شخص کو دیکھنا چاہا۔ گاڑی سیدھی پورچ میں گئی تھی اور اندر سے برآمد ہونے والا شخص یقیناً" ولید احتشام ہی تھا۔ پورچ سے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رکا تھا اور اس قدر اچانک اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا کہ میں بے خیالی میں اس پر جمی نظریں ہٹا بھی نہ سکی تھی۔

اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بڑے اسٹائل سے ہاتھ ہلا کر غالباً "ہیلو کہا تھا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں سر جھٹک کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ چائے پی کر ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو کل شام کا واقعہ ایک بار پھر اپنی تمامتر جزئیات کے ساتھ میری آنکھوں میں گھوم گیا تھا اور رات بھر میں سینکڑوں مرتبہ سوچے گئے سوال ایک مرتبہ پھر شعور کی سطح پر نوکیلے کانٹوں کی طرح اگنے لگے تھے۔

"آخر ایسی کون سی بات تھی جو پتھریلے اعصاب کے مالک جمشید آفندی کو اس حد تک متاثر کر گئی تھی۔" اس کی غیر حالت میرے لیے باعث تعجب تھی۔

"اور وہ مستان شاہ کون تھا اور یہ بات بذات خود کتنی عجیب ہے کہ مستان شاہ انھا ئیس سال قبل مر چکا ہے اور آفندی کہتا ہے کہ وہ آج بھی اس سے ملنے کے لیے آتا ہے۔۔۔۔ یاخدا۔۔۔۔"

میں بے چینی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔

سالانہ تقریب کے بعد "دارالاطفال" دو روز کے لیے بند رہنا تھا۔ اس لیے دو دن انتظار کی کوفت مجھے مجبوراً" اٹھانی پڑی تھی اور جب تیسرے روز وہاں پہنچنے پر عاصم کی زبانی مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنا بزنس ٹور ادھورا چھوڑ کر صرف تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے اور پرسوں شام دوبارہ امریکا روانہ ہو گئے تھے تو میں نے ایک طویل سانس لے کر اس پر سے نظریں ہٹا کر درختوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا جو اس وقت بالکل گم صم کھڑے تھے۔ ایسی ہی کوئی اداس سی چپ مجھے اپنے وجود پہ گرتی محسوس ہو رہی تھی۔ تب میں چپ چاپ واپس گھر لوٹ آئی تھی جہاں و نیزہ کڑے تیوروں کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھی۔

"حد ہوتی ہے یار بے وقوفی کی بھی یہ کوئی موسم ہے

گھر سے باہر نکلنے کا اور پھر سیر و تفریح کے لیے تو وقت ہے ہی نہیں کچھ معلوم ہے ڈیٹ شیٹ آ چکی ہے۔"

اس نے اپنی دانست میں مجھے ڈرانا چاہا تھا مگر میں اپنی سوچوں میں گم اسے تمام نوٹس اور کتابیں بیگ میں ٹھونستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"بہت ڈھیل دے چکی ہوں میں تمہیں مگر اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

اس نے کسی سخت گیر استاد کی طرح مجھے گھورتے ہوئے اٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بغیر کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ چل دی تھی اور پھر نہ صرف ایگزام شروع ہونے سے پہلے بلکہ بعد میں بھی میری اس طرح مدد کی تھی کہ بسا اوقات میں خود سے شرمندہ ہو جایا کرتی تھی۔ اپنا پیپر وہ ہمیشہ وقت سے پہلے مکمل کر لیا کرتی تھی اور پھر سب سے نظر بچا کر وہ بغیر میری مزاحمت کا نوٹس لیے میری شیٹ اپنے قبضے میں لے کر بڑی روانی سے وہ سوال حل کیا کرتی تھی جو میں نہ کر سکتی تھی۔

بچپن سے ایک ساتھ قلم پکڑنا اور ایک ساتھ لکھنا سیکھا تھا سو رائیٹنگ میں انیس بیس کا ہی فرق تھا اور آخری پیپر والے دن جب میں لمبی تان کر سونے اور ونیزہ حماد کے ساتھ آؤٹنگ پہ جانے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی کہ اتنے روز سے اس نے حماد کو صاف منع کر دیا تھا کہ وہ فون کرنے گھر اور خواب میں آنے کی زحمت نہ کرے۔ تبھی داور انکل نے آفس سے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ جرمنی جانے کے لیے ونیزہ کی کل کی سیٹ کنفرم ہو چکی ہے اور یہ خبر پا کر ونیزہ بیچارگی سے مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کے تایا مستقل طور پر جرمنی میں مقیم تھے اور ایک عرصے سے ونیزہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے جو ونیزہ نے اب آ کر قبول تو کر لی تھی مگر اتنی جلدی جانے پر رضامند بھی نہ تھی۔

بہرحال اب اپنے اپنے پروگرام ملتوی کرتے ہوئے وہ دن شاپنگ میں گزارا اور رات پیکنگ کرتے ہوئے اور پھر اس کی ڈھیروں نصیحتیں سمیٹتے ہوئے میں اس وقت ایئرپورٹ سے باہر نکلی تھی جب پی آئی اے کا مسافر بردار طیارہ آسمان کی وسعتوں میں ایک نقطے کی شکل میں معدوم ہو گیا تھا۔ انکل داور اور پھپھو کو خدا حافظ کہہ کر میں گھر کی طرف روانہ ہوئی تو تب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے بیڈ روم کے لیے بے طرح اداس ہوں۔ پیپرز کے دوران سونے کا وقت کہاں ملتا تھا سو اب بھی میں یہ ہی سوچ رہی تھی کہ گرم پانی سے شاور لے کر اس وقت تک سوتی رہوں گی جب تک جاگنے کی شدید خواہش نہ ہو گی اور اس کے بعد۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا تھا اور وہ اپنے پورے قد سمیت میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ تب مجھے یاد آیا چند روز قبل عاصم نے فون پر گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ وہ ایک دو روز میں وطن لوٹنے والا ہے اور فون پر ہونے والی بات چیت کے بعد ہی ونیزہ نے سرسری انداز میں مجھ سے جمشید آفندی کے متعلق پوچھا تھا کچھ لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد میں نے کہا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ میں اس شخص کو لفظوں میں ڈھال سکتی ہوں اس سے متعارف ہونے کے لیے تمہیں خود اس سے ملنا ہو گا۔"

"رئیلی کیا ایسی ہی سپر چیز ہے وہ؟" ونیزہ نے حد درجہ حیرت سے پوچھا تھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"لیس ہی از اونلی ون۔"

"اوہ تمہارے مزاج کی یہ تبدیلی اسی کی مرہون منت تو نہیں۔" اس نے کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا اور میں نے ایمانداری سے اعتراف کیا تھا۔

"ہاں یہ درست ہے کہ زندگی گزارنے کا ڈھنگ میں نے اسی سے سیکھا ہے اور اگر سر راہ وہ مجھے نہ مل جاتا تو شاید میں ان گرد آلود راستوں میں اپنا آپ کھو چکی ہوتی۔" اور میں نے دیکھا تھا کہ ونیزہ نے بہت عجیب سے انداز میں مجھے دیکھ کر اپنا سر جھکا لیا تھا اور تب میں نے اسے پکار کر کہا تھا۔

"سنو۔۔۔ اسے کوئی محبت وحبت کا چکر مت سمجھ لینا وہ ایک مسیحا ہے اور مسیحا سے محبت نہیں عقیدت کی جاتی ہے۔"

گیٹ کھولتے ہوئے چوکیدار نے اس زور دار طریقے سے سلام جھاڑا تھا کہ میں یکلخت ہی اپنے خیالات سے نکل آئی تھی۔

"تو گویا دوسرا اہم ترین کام "دارالاطفال" میں حاضری کا ہے۔" میں دل ہی دل میں سوچتے ہوئے بھرپور نیند کی خواہش لیے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھی تھی مگر پاپا کے لاکڈ بیڈ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹک گئی تھی۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد سے اس کمرے کی چابی میرے پاس تھی اور اس تمام عرصے میں میرے سوا کبھی کوئی اس بیڈ روم میں نہیں جاتا تھا بلکہ میں نے کسی کو اتنی اجازت دی ہی نہیں تھی مگر اب اندر سے آتی آوازوں اور اٹھا پٹخ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کمرے کو نہ صرف کھول دیا گیا ہے بلکہ اندر ایک سے زیادہ افراد موجود بھی ہیں۔

حیران ہوتے ہوئے میں چند قدم پیچھے پلٹ کر آئی تھی اور دروازہ کھولنے کے بعد میں نے کمرے کی جو حالت دیکھی تھی اس نے چند لمحوں کے لیے ساکت کر دیا تھا۔ عجیب بے ترتیبی سی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی پاپا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر "خوش آمدید" کہتے ہوئے محسوس ہوا کرتی تھی اس وقت اپنے مخصوص مقام سے غائب تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل تمام چیزوں سے عاری تھا حتی کہ خالی درازیں یونہی کھلی پڑی تھیں۔ ٹیبل لیمپ آڑا ترچھا زمین پہ گرا ہوا تھا۔ پاپا کے تمام ملبوسات بیڈ پر ڈھیر کر دیئے گئے تھے اور ملازم وارڈ روب کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ششدر سی اپنی جگہ کھڑی کمرے کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھی۔ تبھی ایک ملازم کی نظر مجھ پہ پڑی تو وہ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"شانزے بی بی آپ۔" اس کے لہجے اور چہرے پہ اتنی حیرت تھی کہ جیسے میرا یہاں آنا ان کے لیے انتہائی غیر متوقع ہو۔ یقیناً" انہیں میری غیر موجودگی میں یہ سب کرنے کا حکم دیا گیا ہوگا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے خادم حسین۔" میں شدید دکھ کے عالم میں بولی تھی۔

"بڑی بیگم صاحبہ کا حکم ہے جی کہ یہ کمرہ خالی کر دیں اور چیزیں اسٹور روم میں رکھوا دیں۔" اس نے سر جھکا کر آہستگی سے بتایا تھا۔

"کیا؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہاری بیگم صاحبہ کا اور۔۔۔ اور تم لوگ یہ سب چیزیں اسٹور روم میں رکھنے جا رہے تھے۔" شدید غم و غصے سے میری حالت ابتر ہو گئی تھی۔

"ہم تو ایسا نہیں چاہتے تھے بی بی مگر بڑی بیگم کا حکم تھا اس لیے۔"

"شٹ اپ خادم حسین جہنم میں گئیں تمہاری بیگم صاحبہ اور بھاڑ میں جاؤ تم دونوں آخر تم لوگوں کو یہ جرات کیسے ہوئی کہ اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ بھی لگاؤ۔ اتنا ارزاں سمجھا ہے تم لوگوں نے ان چیزوں کو انہیں اسٹور روم میں رکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔" میرے جسم میں دوڑتے خون کی گردش بے حد تیز ہو گئی تھی۔

"نن نہیں جی۔" ملازم نے بے حد گھبرا کر وضاحت کرنی چاہی تھی۔

"شٹ اپ خادم حسین۔ اینڈ گیٹ لاسٹ فراہم ہیئر۔" میں دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر پوری قوت سے چیخی تھی اور وہ دونوں ملازم میری حالت کے پیش نظر فوراً" سے پیشتر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔

"آئندہ اگر کسی نے اس کمرے میں قدم بھی رکھا تو یاد رکھو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔ خبردار اگر آج کے بعد تمہارے ناپاک ہاتھوں نے اس کمرے کی کسی چیز کو چھونے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گی۔ کیا سمجھا ہے تم لوگوں نے یوں ایمان حسن کو دربدر کر دو گے۔ اس کی ہر نشانی مٹا دو گے۔ مگر ابھی میں زندہ ہوں۔ شانزے ایمان کے جیتے جی تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔"

میں ان کے پیچھے دھاڑی تھی کوئی سرخ رنگ کی آگ تھی جس نے سر سے پاؤں تک مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جسم کا سارا خون جیسے کنپٹیوں میں جمع ہو کر دھڑک رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کیا کر ڈالوں۔ کچھ لمحوں بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ

میں کمرے میں تنہا کھڑی جلا رہی ہوں۔ ملازم نجانے کب کے وہاں سے رفو چکر ہو گئے تھے۔ تب میں نے کمرے کو ایک نظر دوبارہ دیکھا شدید غصے میں میری سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے ایسی دھند تھی کہ کمرے کا منظر بھی مجھ پہ واضح نہیں ہو پایا تھا۔ میں یونہی کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکلی اور قریبی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ میرا دل اس وقت جیسے سلگ رہا تھا۔

"یہ عورت پاپا کا ایک ایک نقش مٹا دینا چاہتی ہے مگر میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گی۔" میرے خون میں ایک بار پھر ابال آنے لگا تھا۔

"ہیلو شانزے ڈارلنگ۔" وہی کانوں میں گھستی ہوئی شاطر آواز میرے عقب میں ابھری تھی اور میں نے لاشعوری طور پر دونوں جبڑے سختی سے ایک دوسرے پہ جما دیئے تھے۔

دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اوپر اٹھا کر میں ابھی انہیں پلٹ کر دیکھ بھی نہ پائی تھی جب وہ پیچھے سے ہی دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر جما کر جھکی تھیں اور اپنے چہرے پہ ان کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرنے سے پہلے ہی میں تڑپ کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔ ان کا چہرہ ایک دم ہی خفت سے سرخ ہو گیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے شانزے؟" انہوں نے غصے و ناراضگی سے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ میں اپنے تیز ہوتے تنفس کے ساتھ بغیر کچھ کہے آگے بڑھی تھی اور ایک جھٹکے سے بیڈ روم کا دروازہ چوپٹ کھول دیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میرے لہجے و انداز پر وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑائی تھیں مگر جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پالیا تھا۔

"ہاں وہ میری ایک فرینڈ آ رہی ہے یہ کمرہ اس کے لیے سیٹ کرنا ہے۔" نظریں چراتے ہوئے انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا تھا۔

"بیسیوں کمرے خالی پڑے ہیں اس محل نما کوٹھی میں پھر یہ ہی کمرہ کیوں؟" میں اپنی سرخ آنکھوں سمیت ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اور کیا آپ نہیں جانتی تھیں کہ یہ کمرہ اور اس کمرے کی ہر چیز مجھے کس قدر عزیز ہے۔" میرا لہجہ تلخ اور آنکھوں میں اس عورت کے لیے تنفر حد درجہ ہی تنفر تھا۔ میرا یہ بپھرا ہوا انداز ان کے لیے نیا ہی نہیں ناقابل قبول بھی تھا۔

"ڈونٹ بی سلی شانزے تمہیں خوامخواہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" ان کا لہجہ ترش تھا۔

"ایک شخص اگر اس دنیا میں موجود ہی نہیں تو اس کی چیزیں سینت سینت کر رکھنے سے آخر کیا حاصل؟ اور تم یہ حقیقت کیوں تسلیم نہیں کر لیتی ہو کہ تمہارا باپ مر چکا ہے اور اس کی کتابیں، کپڑے، سامان محض کاٹھ کباڑ۔۔۔"

"اسٹاپ اٹ۔۔۔ میرے صبر کا پیمانہ جیسے ایک دم چھلک گیا تھا۔

"جھوٹ ہے یہ سفید جھوٹ ہے کہ میرا باپ مر گیا تھا۔ صرف میں ہی نہیں آپ بھی جانتی ہیں کہ میرا باپ مرا نہیں بلکہ اسے۔۔۔"

"شٹ اپ شانزے آئی سے جسٹ شٹ اپ۔" وہ اس قدر زور سے دھاڑی تھیں کہ میرے الفاظ اس شور میں کہیں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جیسے ایک دم خون اتر آیا تھا۔ چہرہ ایک لمحے کے لیے زرد ہوا تھا اور پھر جیسے ان کے جسم کا سارا خون ان کے چہرے پہ جمع ہو گیا تھا۔

"اس کے بعد اگر تم ایک لفظ بھی بولیں شانزے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں میری طرف بڑھی تھیں۔

"سچ سننے کا حوصلہ نہیں اور مار دینے کی دھمکی دے رہی ہیں، کتنا آسان ہے آپ کے لیے ایک جیتے جاگتے انسان۔۔۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہنا چاہا تھا مگر انہوں نے وحشی انداز میں میری بات کاٹ دی تھی۔

"شانزے ڈونٹ میک می لوز مائی ٹمپر میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کروں گی۔"

"برداشت کی حد تو میری ختم ہوئی ہے محترمہ۔ جو بات آپ میری زبان نہیں سن پا رہیں کل وہ آپ کو ساری دنیا سے سننی پڑے گی۔" نجانے کب کار کا ہوا

لا و ا نکلا تھا جو سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت کو سلب کر کے ایک عجیب وحشت دل و دماغ پہ پھیلا گیا تھا۔

"تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی شانزے۔۔۔" وہ عجیب ہسٹریائی انداز میں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔

"میں سب کو بتاؤں گی۔۔۔ ایک ایک کو بتاؤں گی کہ۔۔۔" میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا تھا کہ ان کا پوری قوت سے مارا گیا تھپڑ میرے حواس مختل کر گیا تھا۔ میں لڑکھڑا کر عقب میں دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ وہ کسی وحشی شیرنی کی طرح مجھ پر پل پڑی تھیں۔ میں اپنی جگہ سن سی ہو کر اس ویل ایجوکیٹڈ، ویل مینرڈ، ایک کامیاب سوشل وومن کو ایک دیہاتی، لڑاکا عورت کے روپ میں بدلتے دیکھ رہی تھی۔ وہ میرے دونوں بازو دبوچے کف اڑاتے، سیاہ پڑتے چہرے کے ساتھ چیخ چیخ کر مجھے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کے اس روپ کو دیکھ رہی تھی جو بچپن سے آج تک میری نظروں سے اوجھل رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کوئی حیرت بھری آواز نزدیک سے ابھری تھی۔

"فصیحہ کیا کر رہی ہو چھوڑو اسے آر یو کریزی؟" احتشام احمد نے ایک جھٹکے سے انہیں مجھ سے دور کیا تھا مگر وہ اس وقت آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔

"چھوڑ دو مجھے احتشام آئی ول کل ہر۔" ان کی ہسٹریائی کیفیت نے احتشام احمد کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"احتشام صاحب کرنے دیجیے انہیں جو یہ کرنا چاہتی ہیں ہر مجرم سزا سے بچنے کے لیے جرم کا ہر ثبوت ختم کر دینا چاہتا ہے انہیں بھی یہ کام کرنے دیں۔" میں نے بے خوف و نڈر لہجے میں نفرت سے کہا تھا۔

"میں کہتی ہوں تم اپنی بکواس بند کرو" وہ پوری قوت سے دھاڑی تھیں اور احتشام احمد کی گرفت سے آزاد ہو کر مجھ پہ جھپٹی تھیں۔ میں نے اپنے چہرے پہ بازو رکھ کر اپنا بچاؤ نہ کیا ہوتا تو شاید ان کے لمبے ناخن میرے چہرے کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیتے۔

"فصیحہ پاگل ہوئی ہو تم" احتشام احمد نے اس دفعہ انہیں بازو سے پکڑ کر گھسیٹا تھا اور صوفے پہ گرا دیا تھا۔

"تم نہیں جانتے احتشام یہ میری بیٹی ہونے کے باوجود مجھے دنیا کی نظروں میں ذلیل کرانا چاہتی ہے یہ میرے لیے درد سر بنتی جا رہی ہے۔ پہلے اس ایمان حسن نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اب اس کی زبان اس کے منہ میں آگئی ہے۔ وہ کمینہ، ذلیل شخص خود تو مر گیا مگر اس عذاب کو مستقل میرے سر ڈال گیا ہے۔"

"فصیحہ ہوش میں آؤ کیسی باتیں کر رہی ہو تم، ایک مرے ہوئے انسان کے بارے میں اس طرح کہنا قطعاً مناسب نہیں ہے۔" احتشام احمد ایک غیر انسان ہوتے ہوئے اس بات کو برداشت نہ کر سکا تو میں بیٹی ہونے کے ناتے یہ سب کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دوں جس کی کوکھ سے جنم لینا میرے لیے شرمندگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر وہ تو جیسے خود پر اختیار کھو کر مغلظات پہ اتر آئی تھیں۔ جو میرے لیے برداشت کرنا ممکن نہ تھا اور احتشام احمد انہیں قابو نہ کر پا رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

"شانزے بیٹا رکو۔" احتشام احمد میرے پیچھے لپکے تھے اور میں راستے میں لگنی والی ٹھوکر اور چھلے ہوئے انگوٹھے کی پرواہ کیے بغیر بھاگتی چلی گئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر طوفانی انداز میں گھر سے نکلنے کے بعد میں نے کتنا چاہا تھا کہ گاڑی کسی ہیوی ٹرک سے ٹکرا جائے یا کسی پول سے۔ مگر ایسی کوئی دانستہ کوشش بھی مجھے کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکی تھی۔ سمتوں کے تعین کا اندازہ و ارادہ کیے بغیر گاڑی فل اسپیڈ پہ دوڑاتے ہوئے میں نے اندر کی ساری وحشت ان سڑکوں کو روندتے ہوئے نکالنی چاہی تھی مگر کتنا وقت بیت گیا تھا۔ تبھی گاڑی ہلکے ہلکے جھٹکے کھاتے ہوئے رک گئی تھی۔

"کیا ہوتا اگر آج اس وجود کے پرخچے اڑ گئے ہوتے اور سانس کی ڈور ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی ہوتی۔" میں نے تھک کر اسٹیئرنگ پہ سر گرا دیا تھا۔ تنے تنے

اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ بند آنکھوں سمیت کتنے ہی لمحے یوں چپکے سے گزر گئے تو میں نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔

آسمان کے کناروں پر سرمئی شام اپنا ڈیرہ جما رہی تھی۔ گاڑی میں سے پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنے منجمد وجود کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے باہر نکلی تھی۔ جس طرح انتہائی زوردار زلزلے کے بعد کوئی زمین یکلخت ساکت ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح کا سکوت میرے پورے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے اطراف میں ڈالی سارا ماحول مکمل اجنبی تھا۔ میں نے یونہی سر جھکا کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

کچھ دیر کے بعد ایک گاڑی میرے برابر آ رکی تھی۔

"ایکسکیوز می مس وہ پیچھے جو گاڑی کھڑی ہے آپ کی ہے؟" سوزوکی کار میں بیٹھے آدمی نے پوچھا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے.... میں ڈراپ کر دیتا ہوں یہاں دور دور تک آپ کو سواری نہیں ملے گی۔" میں نے مرے مرے قدم روک کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا چور اچکا لٹیرا کوئی بھی اوباش انسان مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ چند قدم پیدل چلنا بھی میرے لیے دشوار تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ نے۔" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد آدمی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے اپنے سوئے سوئے ذہن پہ پورا زور دیتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی تھی۔

"دارالاطفال۔" ایک اسی جگہ کا خیال آیا تھا سو میں نے اسے ایڈریس بتا دیا تھا وہ نجانے کن کن راستوں سے ہوتا ہوا دارالاطفال تک آیا تھا۔ میں نے دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی یا پھر شاید میں اس پوزیشن میں نہیں تھی۔

"اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔" وہ یقیناً کوئی بھلا آدمی تھا جو مطلوبہ مقام پر گاڑی روکتے ہوئے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ شاید اس نے میری غیر معمولی کیفیت کو نوٹ کر لیا تھا۔ میں نفی میں سر ہلا کر گاڑی سے اتر آئی تھی اور باوجود کوشش کے اس شخص کو شکریے کا لفظ نہ کہہ پائی تھی اسے غالباً اس کی توقع بھی نہیں تھی اسی لیے گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔ کسی حد تک سنسان سڑک کراس کر کے میں "دارالاطفال" کے سیاہ بلند و بانگ گیٹ کے سامنے پہنچی تھی۔

"کیا بات ہے.جی کدھر جا رہی ہیں آپ؟" کسی غیر مانوس آواز پر میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ یہ کوئی باوردی پولیس ملازم تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے اور اس کے پیچھے کھڑے دوسرے پولیس مین کو دیکھا تھا اور ابھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا جب میری نظر سیاہ آہنی گیٹ پر لگے بڑے سے تالے پر پڑی تھی۔ میں نے حیرت سے پہلے بند گیٹ کو اور پھر پولیس والوں کی طرف دیکھا تھا۔ جو ابھی تک سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"یہ۔" میں بری طرح الجھ گئی تھی اور تبھی مجھے احساس ہوا تھا کہ گیٹ پر گلزار خاں کی جگہ یہ پولیس مین کھڑے تھے۔

"یہ بند کیوں ہے؟" ان کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر میں نے دوبارہ پوچھا تھا ان دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"لگتا ہے بی بی آپ اخبار نہیں پڑھتیں۔" ایک نے غالباً میری لاعلمی کا مزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" انجانے خدشے میری آنکھوں کے سامنے اودھم مچانے لگے تھے۔

"اوہو اس کا مطلب ہے آپ کو واقعی خبر نہیں بھئی نیاز احمد انہیں۔" اس نے خوامخواہ ہی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے دوسرے سے کہا تھا۔ ان کے پراسرار لہجے پر میرا دل خوامخواہ ہی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"وہ اس ادارے کے مالک ہیں ناں محترم جمیل آفندی صاحب۔" اس کا لہجہ بے حد طنزیہ تھا۔

"وہ ہیروئن اسمگل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہیں۔"

"کیا؟" میرے حلق سے نکلنے والی آواز چیخ

مشابہ تھی۔ کوئی بم تھا جو میری سماعتوں کے آس پاس پھٹا تھا۔ وجود پہ جما سناٹا ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

"ہاں جی شک تو بڑے عرصے سے ان پر کیا جا رہا تھا۔ مگر بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منا سکتی تھی دیکھ لیں چھری تلے آ ہی گئی اور آپ تو جانتی ہیں قانون کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں کل بمعہ ثبوت کے حراست میں لیا ہے اب تو اس کا پورا گینگ مل کر بھی چاہے تو اسے چھڑا نہیں سکتا۔" وہ چٹخارے لے لے کر بتا رہا تھا اور مجھے اس وقت اپنی سماعتیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ بے اعتبار لگی تھیں۔

"بس جی نیکی کی آڑ میں لوگ کیا کچھ نہیں کرتے کالا روپیہ سفید کرنے کے بہانے ہیں سب۔" وہ دونوں آپس میں اس دکھاوے کی نیکی پر اظہار افسوس کر رہے تھے اور میری سانسیں جیسے میرے ہی وجود میں گھٹنے لگی تھیں۔ میں نے اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو بدقت حرکت دی۔ پاؤں تلے زمین، ریت کی طرح سرکتی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

کس نے کیا کہا؟

سچ کہا یا جھوٹ؟

کچھ معلوم نہ تھا۔ ذہن تمام دروازے کھڑکیاں مقفل کر کے سوچ کا ہر راستہ مسدود کر چکا تھا۔

ایک چہرے کے پیچھے کتنے چہرے؟

کون سا اصل اور کونسا نقل؟

تہ در تہ، پرت در پرت..... اے زندگی ابھی تیرے چہرے سے کتنے نقاب اتریں گے؟

کیا ہے تیری اصلیت؟ کتنی گہرائی میں جا کر تجھے پا سکوں گی؟

میرے قدم اونچے نیچے راستوں پر بے ترتیبی سے پڑ رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں پہ چھائی دبیز دھند کو ہٹانا چاہا۔

"میں کس راستے پر چل رہی ہوں؟" میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ سجھائی نہ دیا۔ ایک سیاہ، گھور، تاریک رات چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔ میں نے بے اختیار ہاتھ مارتے ہوئے اس کالی بلا کو اپنے سے دور ہٹانا چاہا جو مجھے نگل لینے کو بے تاب ہو رہی تھی اور اس سیاہ رات کی آغوش میں سے کتنے بھیانک چہرے مجھے ڈرا رہے تھے۔

"او مانگ بھری میری کامنی۔" کوئی مجھے اپنی گرفت میں لینے کو آگے بڑھ رہا تھا۔

"آئی ول کل یو۔" بال بکھرائے، وحشت زدہ چہرہ میرے قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے ان سے بچنے کے لیے فوراً" پیچھے ہٹنا چاہا تھا تبھی زمین میرے قدموں کے نیچے سے کھسک گئی تھی یا شاید اس کی حد یہاں تک آ کر ختم ہو جاتی تھی۔

میرے لبوں سے ایک تیز چیخ نکلی تھی۔ میں خلا کی بسیط گہرائی میں گرتی چلی جا رہی تھی۔ تب اچانک مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو میں نے فوراً" مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جسے فوراً" ہی کسی نے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"شانزے شانزے۔" کوئی بہت دور سے مجھے پکار رہا تھا کوئی مانوس، جانی پہچانی آواز۔

"پلیز ہیلپ می۔" میں نے ٹوٹتی سانسوں کے درمیان کہنا چاہا تھا اور معلوم نہیں الفاظ میرے ہونٹوں سے نکلے تھے یا نہیں۔

"شانزے تم ٹھیک تو ہو ناں؟" وہ سایہ میرے اوپر جھک آیا تھا اور میں نے کسی کھائی میں گرنے سے بچنے کے لیے پوری قوت سے اس کا بازو تھاما تھا یہاں تک کہ مجھے اپنے ناخنوں میں خون کی چپچپاہٹ کا احساس ہوا تھا۔ مگر میری یہ کوشش بے سود ہی ثابت ہوئی تھی اور اندھیری بلا مجھے نگلتی چلی گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اماوس کی رات میں کوئی جگنو چمکا تھا جسے ہاتھ میں لینے کی خواہش کرتے ہوئے میں نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر مجھے اپنے کندھوں پر بے تحاشا بوجھ محسوس ہوا تھا اس کے ساتھ ہی بازو میں سوئی کی تیز چبھن کا احساس ہوا تو میں کراہ کر رہ گئی تھی اور اسی

چبھن نے لاشعور سے شعور تک کا رابطہ بحال کر دیا تھا۔

"کیا میں زندہ ہوں؟" آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پہلا سوال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

"شانزے جانو کیسی ہو تم میری آواز سن رہی ہو نا؟"

نرم، شیریں آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ ہی دو پتلی پتلی انگلیوں کا لمس مجھے اپنے بالوں میں محسوس ہوا تھا۔ میں نے اس دھندلے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی اور ذرا ذرا نقوش گھرے ہوئے تو وہ ملائم مسکراہٹ والا چہرہ ایک دم بہت بھیانک ہو گیا تھا۔

"آئی ول کل یو۔" کوئی ہسٹریائی انداز میں میرے قریب چیخا تھا۔ بالوں کو سہلاتی انگلیاں پتلے پتلے سانپ بن کر میری گردن سے لپٹنے لگے تھے۔ خوف کی شدت سے بے حال ہوتے ہوئے میں نے ایک جھٹکے سے اپنے اوپر جھکے وجود کو ہٹانا چاہا تھا۔

"ڈیئر میں تمہاری مما ہوں چندا آنکھیں تو کھولو ناں؟"

"پلیز ہٹاؤ اسے کون ہے یہ..... مجھے نفرت ہے اس سے..." میں چکر پھیریاں کھاتے دماغ کے ساتھ چلائی تھی۔

"ایسا مت کہو شان آر یو مائی چائلڈ....." وہ کند چھری سے مجھے ذبح کر رہی تھیں۔

"مگر مجھے نفرت ہے تم سے تمہاری آواز سے تمہاری شکل سے آئی ہیٹ یو آئی ہیٹ یو۔" میں پوری قوت سے چیخنا چاہ رہی تھی۔

مگر میرے بدن کی زائل ہوتی قوت میرا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ میرے بازو تھک کر میرے پہلو میں جا گرے تھے اور ادھ کھلی آنکھیں بے دم ہو کر سو گئی تھیں۔ زبان سے نکلتے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادھ موئے ہو کر ہونٹوں پہ دم توڑ گئے تھے اور ذہن ہزاروں فٹ نیچے کسی اندھی کھائی میں گرتا چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

سر نخل جاں
کوئی رات اتری ہے آگ سی
چاند، تاروں سے بے نیاز
روشنی سے نا آشنا
سلگتی، تپتی وہ رات سی
مجھے لے رہی ہے حصار میں
میں گھسٹ رہی ہوں پا برہنہ
اس ریتلے سے عذاب میں
کوئی آسمان!
کوئی آسماں بھی نہیں ہے
قرب و جوار میں
میری روح بھٹک رہی ہے
کوئی راستہ!
کوئی راستہ بھی نہیں ہے
نظر حدود میں
مجھے پانی دو
مجھے چند بوندیں نواز دو
میری سانس لاغر ہو رہی ہے
آنسوؤں کے ہجوم میں
میں لمحہ لمحہ پگھل رہی ہوں
بے یقینی کی آگ میں

♥ ♡ ♡ ♥
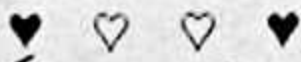
"شانزے..... شانزے....." کسی نے ایک مجھے جھنجوڑ کر اس خوفناک اور بھیانک خواب کی سے آزاد کرایا تھا جو نہ جانے کتنی دیر سے مجھے گرفت میں لیا ہوا تھا۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ م سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور زبان خشک کر تالو سے چپک گئی تھی۔ حلق جیسے خار بن کر جاتی سانسوں کو چیر رہا تھا۔ تبھی کسی نے میرا سر اونچا کر کے پانی کا گلاس میرے خشک ہونٹوں جسے میں ایک ہی سانس میں خالی کر گئی تھی۔

"اب ٹھیک ہو ناں؟" انتہائی نرم، مہربان پوچھا گیا تھا۔
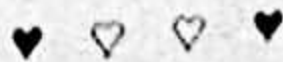
"شاید تم خواب میں ڈر گئی تھیں۔۔۔۔" وہ دوبارہ گویا ہوا تھا مگر میں نے بغیر کوئی جواب دیئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ لمحوں بعد سانس بحال ہوا تو میں نے گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ہاسپٹل کی سفید دیواروں کی بجائے لائٹ پنک دیواروں پر نظر پڑی تو اپنے بیڈ روم میں ہونے کا احساس مجھے یک گونہ تسکین دے گیا تھا۔

میں پچھلے پندرہ دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی تھی اور ان پندرہ دنوں میں میری حالت اس قدر دگرگوں ہو چکی تھی کہ میری عیادت کو آنے والے لوگ حیرت و تاسف کا اظہار کرتے اور ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ میری حالت کے پیش نظر مجھے زیادہ وقت مسکن ادویات کے زیر اثر رکھا گیا تھا مگر مجھے کسی طور چین نہ تھا۔ مدہوشی میں عجیب و غریب چہرے مجھے ڈراتے رہتے۔ ہوش میں آتی تو ان دو سبز آنکھوں کا کانچ میری پلکوں میں چبھنے لگتا۔

"بتاؤ بھلا ایسے حسین، خوب صورت چہرے ایسے بھیانک اور بد نما بھی ہو سکتے ہیں۔

وہ جو کانچ جیسا تھا صاف اور شفاف۔

وہ جو فرشتوں جیسا تھا پاکیزہ مصفا۔

وہ جس کی آنکھیں دوسروں کے دکھ پر بھیگ جایا کرتی تھیں۔

وہ جس کی آنکھوں میں دوسروں کو خوش دیکھ کر ہزاروں دیپ ایک ساتھ جل اٹھتے تھے۔ بھلا وہ اس زہر کی سوغات بانٹ کر اندھیرے کس طرح تقسیم کر سکتا ہے وہ تو مسیحا تھا پھر گھاؤ کیسے لگا سکتا تھا وہ۔۔۔۔ بتاؤ بھلا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہوا ہے کبھی؟" میں دیوانہ وار چیخ چیخ کر اپنے سامنے آنے والے ہر فرد سے پوچھتی۔ ڈاکٹرز سے سوال کرتی جو میرے ہر سوال پر نظریں چرا لیتے۔ نرسوں سے سوال کرتی جن کی آنکھوں میں میرے لیے صرف اور صرف رحم تھا، ترس تھا۔ مگر میرے کسی سوال کا کسی کے پاس جواب نہ تھا سوائے "ریلیکس ٹیک اٹ ایزی" اور ٹرنکولائزرز کے اور بالآخر میں نڈھال ہو کر تکیے پہ سر پٹخ پٹخ کر رو دیتی روتے روتے بے حال ہو جاتی اور پھر مدہوش ہو کر چہروں کے اس جنگل میں جا نکلتی جہاں ہر چہرے پہ ایک نقاب تھا۔ تب پھر اس آنکھ مچولی سے تھک کر میں نے چپ سادھ لی خود کو مکمل طور پر مردہ تصور کر کے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور بالآخر ہاسپٹل کی سفید دیواروں والے پرائیویٹ روم سے اپنے بیڈ روم میں منتقل ہو گئی۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر ولید احتشام کو دیکھا جو پر سوچ نظریں مجھ پر جمائے بیٹھا تھا۔

"تین بجے ہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"رات کے؟" میری نظریں بے اختیار کھڑکی کی طرف گئیں جو ہمیشہ مجھے بیڈ روم کے باہر کے موسموں کا پتہ دیا کرتی تھی۔ مگر اس وقت پردے برابر ہونے کے باعث مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا تھا۔

"ہاں۔۔۔ پردہ ہٹا دوں۔" اس نے میری نظروں کو جانچ لیا تھا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ملگجا لباس تھکن زدہ وجود بے خوابی کی شکایت کرتی سرخ آنکھیں اور پیشانی پہ بکھرے بے ترتیب بال۔

اور نجانے کیوں اس شخص کو یہاں دیکھ کر مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ گزشتہ کئی دنوں سے سائے کی طرح میرے ساتھ ہے ہاسپٹل کا کمرہ تھا یا یہ بیڈ روم جس جس لمحہ بھی میری آنکھ کھلی تھی میں نے اسے پریشان و متفکر اپنے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا اور کیا وجہ ہے کہ رات کے اس پہر بھی یہ اتنی ہی مستعدی اور اتنی ہی مستقل مزاجی سے مجھے لک آفٹر کرنے کو یہاں موجود ہے۔

میں نے ایک نظر اسے دیکھ کر سوچا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہی ہو شانزے؟" اس نے نزدیکی کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔ چہرے کے برعکس ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ بہت فریش تھی۔

"بہتر ہوں۔" میں نے مختصر کہہ کر نظریں کھڑکی

سے باہر مکمل اندھیرے پہ جمادی تھیں۔
"دسنو تم نے اپنے چہرے پہ کتنے نقاب چڑھا رکھے ہیں؟" میں نے اچانک ہی پوچھا تھا۔
"آپ کو یہ شک کیونکر ہوا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے جوابی سوال داغ دیا تھا۔
"شک نہیں۔۔۔ اب تو یقین ہو چلا ہے۔۔۔ ایسے ایسے چہروں کو بے نقاب ہوتے دیکھا ہے کہ خود پر سے بھی اعتبار اٹھنے لگا ہے۔"
"نہیں شانزے جی چہرے دھوکا نہیں دیتے ہم خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ دوسروں کے دیکھنے کے لیے ہماری نظر کا زاویہ ہی غلط ہو تو اس میں ہمارا قصور ہوا نہ کہ چہرے کا۔" اس نے بہت نرمی سے گویا میری غلطی کی نشاندہی کی تھی۔
"تو گویا سارا قصور، ساری غلطی میری ہی ٹھہری تھی۔۔۔" میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس کی شدید مخالفت کرتی مگر اب میں نے ہارے ہوئے انسان کی طرح بڑی آسانی سے دوسروں کی غلطیاں بھی اپنے کھاتے میں ڈال دی تھیں اور شاید میرے لہجے کی تھکن اس نے بھی محسوس کی تھی اسی لیے اس نے بات بدل دی تھی اور مجھ سے جوس کے متعلق پوچھنے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر گردن موڑتے ہوئے دوسری طرف ایزی چیئر پہ اونگھتی نرس کو دیکھا۔
"ان فیکٹ مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں کتاب سمیت یہاں چلا آیا اور غالباً" میری موجودگی نے ہی سسٹر کو غافل کر دیا ہے۔" اس نے جوس کا گلاس میری طرف بڑھایا جسے میں نے بغیر کچھ کہے تھام لیا تھا۔ پھر کچھ لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔ میں یونہی خالی الذہنی سے کھڑکی سے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھتی رہی۔
"ولید کیا واقعی آفندی صاحب۔۔۔؟" میں کوشش کے باوجود جملہ مکمل نہ کرسکی تھی۔
"میرا خیال ہے اس ٹاپک پر پھر کبھی بات کریں گے۔" اس نے ٹالنا چاہا تھا۔
"پلیز۔۔۔" میں نے ملتجی ہو کر اصرار کیا۔
"ہاں حالات اور شواہد تو کچھ ایسا ہی بتاتے ہیں۔" اس نے بنظر غائر مجھے دیکھتے ہوئے بتایا تھا اور میرے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس لرز گیا تھا۔
"الزام ثابت ہو چکا ہے؟" میں اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔
"مال سمیت اریسٹ کیا گیا ہے اس کو مگر بہرحال کیس تو چلے گا۔" بہت ضبط کرنے کے باوجود اندر کہیں زلزلہ سا آیا تھا۔ چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا اور کرچیاں بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا اور خود گھٹنوں پہ سر رکھ کر اپنے جھٹکے کھاتے وجود کو نارمل کرنا چاہا تھا۔ ایک دم عجیب وحشت سی محسوس ہوئی تو میں کمبل ہٹا کر بیڈ سے نیچے اترنے لگی تھی۔
"کیا ہوا؟" اس نے گلاس فوراً" میز پہ رکھا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ کھٹکے سے نرس کی آنکھ بھی کھل گئی تھی وہ فوراً" ہی اپنی پیشہ ورانہ مستعدی لیے میری طرف بڑھی تھی۔
"میڈم کہاں جانا ہے؟"
"باہر۔۔۔" میں نے بیڈ کے پاس پڑی چپل میں پاؤں گھسائے۔
"مگر باہر بہت سردی ہے میڈم۔۔۔" اس نے فوراً" مجھے کاندھوں سے تھام کر روکنا چاہا۔
"اندر بہت گھٹن ہے۔۔۔ مجھے باہر جانا ہے۔" میں سختی سے کہہ کر اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے کھڑی ہوئی تو ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئی۔
"پلیز آپ بیٹھ جائیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کر ایک بار پھر زور دیا تو میں اس کی ضد پر اکتا کر ولید کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے گویا میری نظروں کا مفہوم جان لیا تھا جبھی وہ دو قدم آگے بڑھ آیا تھا۔
"اوکے۔۔۔ آؤ میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔۔۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب چل دیا تھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس وقت مکمل طور پر دوسروں کے رحم و کرم پر تھی نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی طور پر بھی حتیٰ کہ میں یہ فیصلہ بھی نہ کرپا رہی تھی کہ آیا مجھ

اس شخص کا سہارا لینا بھی چاہیے کہ نہیں۔ یونہی میکانکی انداز میں اس کے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے میں پاپا کے بیڈ روم کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ تب اس نے ایک دم سارا دروازہ کھول دیا تھا۔

"یہ کمرہ تمہیں اسی طرح پسند ہے ناں؟ دیکھ لو ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔"

دونوں ہاتھ سینے پہ باندھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ جبکہ میری نظریں پاپا کی فریم شدہ تصویر پہ تم گئی تھیں جو اپنے مخصوص مقام پر آویزاں تھی۔

"پاپا۔۔۔ کہاں چلے گئے ہیں آپ؟" میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی تصویر کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"آجائیے ناں۔۔۔ مجھے آپ کی بے حد ضرورت ہے۔" میں نے کپکپاتی انگلیوں سے تصویر کے نقوش کو چھوا۔

"دیکھیے۔۔۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک طوفان ہلکورے لے رہا ہے۔ میں یہ سارے آنسو آپ کے ساتھ مل کر بہا دینا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں دکھ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔۔۔ پاپا میں آپ کے بغیر اسے شکست نہیں دے پاؤں گی۔ مجھے آپ کا سہارا چاہیے۔ پلیز لوٹ آیئے ناں۔"

میرے دل سے ہوک اٹھ رہی تھی اور اس لمحے میرے دل نے کتنی شدت سے خواہش کی تھی کہ یہ بے جان تصویر سانس لینے لگے۔ پاپا میری درد بھری پکار پر کانچ کے اس حصار سے آزاد ہو جائیں۔ ان کے ملبوس سے اٹھتی مہک میرے اردگرد پھیل جائے اور میں ان کے سینے پہ سر رکھ کر وہ سب کچھ کہہ ڈالوں جو میرے وجود کو اندر ہی اندر گھن بن کر کھوکھلا کر گیا تھا۔ مگر ہوا کیا تھا؟

میری خواہش حسرت بن کر رات کے سینے میں گڑ گئی تھی اور میں بھری مٹی کی مانند زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"شانزے۔" عقب میں کھڑے ولید احتشام نے سراسیمہ ہو کر مجھے پکارا تھا۔

"پاپا۔۔۔ مجھے آج احساس ہوا ہے کہ آپ مر چکے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں آپ کی آنکھیں میرے دکھ میں بالکل بھی نم نہیں ہوئیں۔ آپ کے ہونٹوں پر میرے لیے کوئی دلاسا نہیں۔ آپ کے بازو مجھے اپنی پرشفقت آغوش میں پناہ دینے کے لیے وا نہیں ہوئے۔ پاپا آپ نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔" میں دل ہی دل میں شکوہ کناں تھی۔

"شانزے تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے چلو تمہیں بیڈ روم تک لے چلوں۔" وہ میرے درد سے بے حال ہوتے وجود کو سہارا دے رہا تھا۔

"ولید۔" میں نے جیسے سمندر میں ڈوبتے ہوئے تنکے کا آسرا لینا چاہا تھا۔

"ولید۔۔۔ میں رونا چاہتی ہوں۔" میری آواز آنسوؤں میں گھل گئی تھی اور لہجے میں حد درجہ بے بسی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا تھا اور پھر مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"تم جتنا رونا چاہتی ہو رو لو شانزے۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں تمہارے آنسوؤں کو اپنے دل میں سمیٹ سکوں۔"

اس کے دوست نواز ہمدرد لہجے نے میرے ضبط کی آخری فصیلیں بھی گرادی تھیں اور پھر اپنے ہی بازوؤں میں سر چھپا کر روتے ہوئے میں نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا جسے جھٹلانے اور چھپانے کی کوشش میں اس زندگی نے چین سکون، آرام اور اعتبار کے سب دروازے مجھ پر بند کر دیے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥
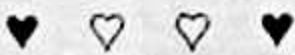
"کہا جاتا ہے کہ فطری طور پر بچہ باپ کی نسبت ماں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مگر میرے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میری پیدائش میں اگر کسی فرد کی خواہش اور خوشی شامل تھی تو وہ صرف میرے پاپا تھا۔ مما کا خیال تھا کہ بچے کی آمد کی وجہ سے ان کی سوشل لائف بالکل ڈل ہو کر رہ جائے گی۔ لہٰذا ادھر اس دنیا میں میری آمد ہوئی ادھر انہوں نے مستقل طور پر ایک آیا کا بندوبست کر دیا۔ پاپا کا خیال تھا کہ میری اچھی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مما مجھے اپنا دودھ پلائیں مگر مما بیوقوف نہ تھیں کہ اپنا فگر خراب

کر تمیں یہاں انہوں نے میرا سب سے پہلا حق غصب کیا تھا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے جاری ہو گیا تھا۔

میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو پیار' محبت' شفقت' چاہت' خلوص و ہمدردی اور ہر رشتے کو اپنے پاپا کی شکل میں پایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ماں کے فرائض کیا ہوتے ہیں' ممتا کا لمس کیا ہوتا ہے۔ جس جس چیز کی مجھے ضرورت تھی وہ میں نے اپنے باپ سے وصول کی تھی۔ میں صبح اٹھتی تو ان کی صورت دیکھنا چاہتی ۔ رات کو جب تک وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر لوری نہ سناتے مجھے نیند نہ آتی۔ ذرا بڑی ہوئی تو آیا کے ہاتھ سے ناشتا کرنا مجھے زہر لگنے لگا تھا۔ میں فوراً" پاپا کی گود میں سوار ہو جاتی اور کبھی کبھی نجانے کیوں میں چاہتی کہ پاپا آج میرے ساتھ رہیں ایک پل کے لیے میری نظروں کے سامنے سے اوجھل نہ ہوں تب میں زور زور سے رونے لگتی' بے تحاشا روتی تو پاپا ضروری سے ضروری میٹنگ بھی کینسل کر دیتے خواہ' انہیں کروڑوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔

چند سال مزید گزرے تو اپنی اس عادت پر میں نے خود ہی قابو پا لیا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اس طرح پاپا بری طرح اپ سیٹ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ میری آنکھ میں ہلکی سی نمی بھی برداشت نہ کر پاتے تھے۔ انہی دنوں ایک روز ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے بری طرح ہراساں کر دیا تھا۔ رات کا کوئی وقت تھا جب میں اپنے کمرے میں کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ آیا اکتائے اکتائے لہجے میں کئی بار مجھے سونے کے لیے کہہ چکی تھی مگر مجھے پاپا کا انتظار تھا۔ اسی دوران ایک دم لائٹ آف ہو گئی۔ کھلونوں میں مصروف میرے ہاتھ ایک دم ساکت ہو گئے تھے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی آیا کو پکارنا چاہا تو جواب میں اس کے زوردار خراٹوں نے مجھے ڈرا کر رکھ دیا۔ مجھے لگا جیسے جنگل میں کوئی بھیڑیا میری گھات میں بیٹھا غرا رہا ہے۔ کمرے میں موجود تمام اشیاء مجھے بھوت بن کر ڈرانے لگی تھیں۔ میں اس لمحے بے حد خوفزدہ ہو چکی تھی۔ میرا جسم کانپنے لگا تھا اور سانس رکنے لگی تھی۔ مگر میں نے ایک مرتبہ پھر آیا کو پکارنے کی کوشش کی مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

نجانے کب تک میں یونہی ہراساں و سراسیمہ گھٹنوں میں سر چھپائے بیٹھی رہی تھی کہ مجھے باہر سے پاپا کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے میرے متعلق پوچھ رہے تھے۔ ان کی آواز نے جیسے مجھے طاقت بخشی اور میں پوری قوت سے اٹھ کر اس اندھیر نگری سے نکل بھاگی تھی۔ خوف و دہشت کی وجہ سے میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ میرا کمرہ دوسری منزل پر ہے۔ سو بھاگتے ہوئے سیڑھیوں کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور میں سب سے اوپر والی سیڑھی سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری تھی۔ میری زوردار چیخ پر پاپا میری طرف دیوانہ وار لپکے تھے۔ میری پیشانی سے بہتے خون نے جیسے انہیں پاگل کر دیا تھا آیا اور ملازمین کی جو درگت بنی سو بنی رات گئے جب مما کسی پارٹی سے واپس آئیں تو پاپا غیض و غضب سے بے حال ہو کر ان پر الٹ پڑے تھے۔ میں نے اس سے پہلے پاپا کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ مما کو یہ احساس دلا رہے تھے کہ میں ان کی اولین ذمے داری ہوں اور وہ اپنے فرائض سے غفلت برت رہی ہیں مگر مما کسی طرح اپنی غلطی تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھیں۔

ان کے درمیان چھڑی دھواں دھار جنگ نے مجھے مزید پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بھاگ کر پاپا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور رو رو کر انہیں خاموش ہو جانے کو کہہ رہی تھی۔ تب پاپا نے مجھے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ وہ مجھے لیے دوسرے کمرے میں آ گئے تھے اور مجھے بے تحاشا پیار کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تھے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے

"میں چاہتا تھا کہ جو محرومیاں میری زندگی میں مجھے ملی تھیں وہ تمہارا مقدر نہیں بنیں مگر مجھے لگتا ہے شان ۔۔۔ تمہاری اور میری قسمت بالکل ایک جیسی ہے۔"

میں نے اپنے بیڈ سے پاپا کو یوں بری طرح روتے دیکھا تو اسی لمحے دل میں عہد کر لیا تھا کہ آج کے بعد میں نہ اندھیرے سے ڈروں گی اور نہ روؤں گی۔

میری وجہ سے پاپا کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ اس
کے بعد پاپا اکثر مجھے پھپھو کی طرف لے جاتے جہاں
میری ہم عمر ونیزہ کے ساتھ میری گاڑھی چھنتی تھی۔
پاپا چاہتے تھے کہ میں ماں کی محبت کو محرومی نہ بنالوں سو
وہ پھپھو کو خاص طور پر میرا خیال رکھنے کو کہتے۔
اگرچہ پھپھو بھی مکمل گھریلو خاتون نہ تھیں مگر ان
کا لائف اسٹائل مما سے قدرے مختلف تھا وہ دن میں
میرے اور ونیزہ کے لیے کچھ وقت ضرور نکالتی تھیں۔
پھر کئی سال تک یوں رہا کہ میں مہینوں ونیزہ کے گھر
رہتی پاپا سے ہر روز ملاقات ہوتی اور مما کا چہرہ دیکھے
بھی کئی دن ہو جاتے میں اور ونیزہ اپنی ہی دنیا میں مگن
ہو گئے تھے۔ تبھی ایک دن میں گھر چلی آئی کیونکہ اس
روز پاپا پھپھو کی طرف نہیں آئے تھے۔ ملازم نے بتایا
کہ پاپا آج سر شام ہی لوٹ آئے تھے اور اس وقت گھر
میں ہی موجود ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ پاپا گھر میں ہوں تو ہمیشہ اپنی
مخصوص جگہ پر ہی ہوتے ہیں لہٰذا میں دبے پاؤں وہاں
چلی آئی تھی۔ پاپا ایزی چیئر پر بیٹھے تھے۔ کتاب ان کی
گود میں کھلی پڑی تھی مگر نظریں گلاس وال سے باہر
ڈوبتے سورج کا طواف کر رہی تھیں۔ تھکے ماندے
آفتاب کی بوجھل نارنجی کرنیں لان میں بکھرے
پھولوں اور درختوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھیں۔ بے
حد زرد اور اداس شام تھی۔ میں نے ذرا سا سامنے کی
طرف آتے ہوئے پاپا کو دیکھا۔ ایسی ہی زرد اور اداس
شام ان کی سیاہ آنکھوں میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی۔
چہرے پہ شکستگی اور تھکاوٹ کے اثرات نمایاں تھے۔
وہ جیسے یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں موجود نہیں تھے۔
نجانے کیوں مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ مجھے یوں
لگ رہا تھا جیسے میں نے پاپا کو بہت عرصے کے بعد دیکھا
ہو۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ان کے سامنے کارپٹ پر
دوزانو ہو کر بیٹھ گئی تھی مگر وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئے
تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے بہت دور ہوں۔ میں نے
گھبرا کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں پکارا۔
انہوں نے بغیر چونکے نظروں کا زاویہ بدل کر مجھے دیکھا
تھا اور پھر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں
کے تاثرات یکلخت بدل گئے تھے۔ ایک خوشگوار
حیرت ان کی آنکھوں سے چھلکنے لگی تھی۔

"شانزے جانو میں ابھی تمہارے بارے میں ہی
سوچ رہا تھا۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ
تھام کر کہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا میری موجودگی پاپا کو
کس طرح آسودہ کر دیتی تھی۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگی
تھیں اور عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

"پاپا.... آپ اداس تھے ناں؟" مجھے یقین تھا پاپا
انکار کر دیں گے مگر وہ شاید اپنی اس طویل تنہائی سے
بیزار ہو چکے تھے۔ میری صورت میں ایک غمگسار کو
سامنے دیکھا تو اثبات میں سر ہلا گئے۔

"ہاں بیٹا.... میں بہت اداس تھا۔" انہوں نے
تھکے تھکے لہجے میں اعتراف کیا تھا اور اپنے اسٹرونگ
سے پاپا کی یہ کمزوری مجھ سے برداشت نہ ہو سکی تھی۔
میں جان گئی تھی کہ میری عدم موجودگی پاپا کو اداس کر
دیتی ہے سو اس دن کے بعد سے میں نے کالج کے سوا
کہیں بھی جانا بند کر دیا تھا۔ ونیزہ ناراض ہوئی مگر میں
نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اب پاپا کے بغیر
نہیں رہ سکتی اس دن میں نے بچپن کی معصومیت سے
پختگی کی سنجیدگی میں قدم رکھا تھا اور اسی دن کے بعد
سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ مما کی روٹین آج بھی نہیں
بدلی۔ انہیں اپنے شوہر، بچی اور گھر سے زیادہ وہ پارٹیز وہ
فنکشن زیادہ عزیز تھے جہاں ان کے حسین ترین
سراپے کو سراہنے کے لیے ہزاروں نظریں بیک وقت
ان کے گرد گھیرا ڈالے رکھتی تھیں۔ انہیں پاپا کی پسند
پر ہاؤس وائف بننا پسند نہیں تھا۔ پاپا کے ہر اعتراض
کے جواب میں وہ اپنے تنے ہوئے ابرو اچکا کر کہا
کرتیں۔

"ایمان حسن.... میں تمہارے اشاروں پر ناچنے
کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔ میرا اپنا لائف اسٹائل
ہے سو مجھے میری زندگی جینے دو ہاں اگر تمہیں پتی ورتا
ٹائپ بیوی کی ضرورت ہے تو جان لو کہ میرا انتخاب کر
کے تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے اور اگر تم کوئی نیا
انتخاب کرنا چاہو اپنی پسند کے مطابق تو تمہیں میری
طرف سے اجازت ہے تم جب چاہو اپنا راستہ الگ کر

سکتے ہو۔" وہ بڑی نزاکت سے کندھے جھٹک کر اپنے
مرمریں بازو میں پہنے جگمگاتے بریسلٹ کو گھماتیں اور
زہر میں بجھے تیر پاپا کی طرف اچھال کر آگے بڑھ جاتیں
۔انہیں معلوم تھا ایمان حسن آج انہیں آزاد کر دے
تو ہزاروں ہاتھ انہیں تھامنے کے لیے آگے بڑھ آئیں
گے پاپا زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تو میں
نظریں جھکا کر رہ جاتی۔

"صرف تمہاری خاطر میں ہمیشہ اس عورت کو
برداشت کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔" وہ میری خاطر
بے بس ہو جاتے اور کبھی جو میں ان کی خاطر مما کو
سمجھانے کی کوشش کرتی کہ وہ کچھ وقت گھر کو دیا کریں
تو وہ الٹا مجھے سمجھانے لگتیں۔

"ڈونٹ بی سلی شان زندگی اس طرح نہیں گزاری
جا سکتی جس طرح تم اور ایمان حسن گزار رہے ہو اور
تم کیوں سارا دن گھر میں گھسی رہتی ہو بھئی باہر نکلو' دنیا
دیکھو' لائف انجوائے کرو اور نہیں تو کوئی کلب ہی
جوائن کر لو تمہاری عمر میں تو لڑکیاں......"

وہ چہرے کا مساج کرتے ہوئے میرے مضحکہ
اڑانے لگتیں تو میں وہاں سے چڑ کر اٹھ جاتی۔ پھر میں
اور پاپا ایک دوسرے کی ذات میں اس حد تک گم
ہوتے گئے کہ کسی تیسرے کی پرواہ کرنا ہی چھوڑ دیا۔
اپنا ہر دکھ سکھ ہم ایک دوسرے سے شیئر کر لیتے۔
رات گئے تک چائے اور کافی کے ساتھ اسٹڈی روم
میں بیٹھے رہتے۔ دنیا کا کون سا ایسا موضوع تھا جو ہم
دونوں کے درمیان ڈسکس نہ ہوتا تھا۔ شاعری'
ڈرامہ' نثر' مصوری' سیاست' سیاحت' تصوف غرض
بات سے بات نکلتی چلی جاتی اور پھر کبھی آتشدان کے
سامنے بیٹھ کر ڈرائی فروٹ اڑاتے ہوئے میں پاپا کو کالج
کی ساری باتیں سناتی تو میں محسوس کرتی کہ لکڑیاں
چٹخاتی آگ پر نظریں جمائے پاپا کسی گہری سوچ میں
ڈوبے ہوئے ہیں۔ تب میں ان سے اصرار کرتی۔

"پاپا۔ بتائیں ناں کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ پر سوچ
نظریں میرے چہرے پہ جما دیتے۔

"سوچ رہا ہوں وہ کیسا لمحہ تھا جب میں نے تمہاری
مما کو دادا کی عظیم الشان حویلی میں بارش میں بھیگتے
دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جھولا جھول رہی تھی جب
میری لینڈ کروزر حویلی کی پتھریلی روش پر رک گئی تھی۔
آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ یکایک بوندوں کی
بوچھاڑ ہوئی تھی اور **فصیحہ** نے بارش سے بچنے کے
لیے بھاگ کر برآمدے میں پناہ لی تھی۔ وہ مکمل گھریلو
حلیے میں تھی کسی بھی آرائش سے بے نیاز چہرہ۔
بے حد جاذب نظر تیکھے نقوش اور ان نقوش پر حاوی
معصومیت (جو اس کوٹھی میں آکر نجانے کہاں کھو گئی
تھی) وہ گھر بھر کی ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی اور تب
میں نے دل میں سوچا تھا کہ یہ ہی لڑکی میرے گھر میں
اجالا بن کر اترے گی والدین کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر
میں نے اسے اپنایا تھا اور سمجھا تھا کہ میں جیت گیا
ہوں مگر مجھے کہاں معلوم تھا کہ میں تو اس لمحے اپنی
زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا تھا۔" پاپا کا افسردہ
لہجہ مجھے بری طرح دکھی کر دیتا۔ مگر وہ دل کی ہر بات کہہ
جاتے۔

"میری ماں ایک مشہور فیشن ڈیزائنر تھی اور باپ
بزنس سرکل میں "کنگ" کے نام سے مشہور تھا مگر
میں ساری عمر ان دونوں کو ترستا رہا۔ ماں کی گود میں سر
رکھنے کی خواہش اور باپ سے ضد کر کے بات منوانے
کی آرزو میرے دل میں جنم لیتی اور دم توڑ دیتی۔
میرے دوسرے بہن بھائی مجھے "مڈل کلاسیا" کہا
کرتے تھے۔ یہ تمام حسرتیں میرے ساتھ پل کر جوان
ہوئی تھیں۔ اور میں جو لوئر مڈل کلاس سے **فصیحہ** کو
اپر کلاس میں لے کر آیا تو صرف اس لیے کہ میرے
بچے "ماں" کے ہوتے ہوئے بھی "ماں" کو ترستے نہ
رہا کریں۔ مگر قسمت مجھے یہاں بھی دھوکا دے گئی۔
مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ **فصیحہ** اڑنے کی خواہش میں
آسمان کو چھونے کی تمنا کرنے لگے گی۔

میں گھر کے سکون کی خاطر اسے ڈھیل دیتا رہا اور وہ
میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگی اور بیٹا تمہاری
وجہ سے میں اس سے تعلق توڑ نہیں سکا ماں جیسی بھی
ہو ماں ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا تم اسے اپنی طرف
متوجہ کر سکو گی مگر نجانے کیسی نا تمام خواہشات اس
کے دل میں پلتی رہی تھیں کہ جنہیں تمام کرنے کی

کوشش میں وہ تمہیں بھی بھول بیٹھی ہے۔"

تب میں پاپا کو تسلی دیتی۔ انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ میں جس حال میں بھی ہوں مطمئن ہوں اور پھر ایک روز۔"

میں کچھ دیر سانس لینے کو رکی تھی ولید احتشام منتظر نظریں مجھ پر جمائے خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے فوراً "بولنے پر مجبور نہیں کیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں میری زبان گنگ ہو جاتی ہے اور الفاظ چپ کی زنجیر میں بندھ جاتے ہیں۔ میں نے اندر ہی اندر اپنی قوت بحال کی تھی۔ میں اس بوجھ کو ہر حال میں سینے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔

"اور پھر ایک روز گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔" میں نے ہمت مجتمع کر کے پھر سے کہنا شروع کیا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس ہنگامے کا محرک کیا ہے۔ میں بس اتنا دیکھ پا رہی تھی کہ پاپا از حد غصے میں تھے۔ انہیں غصہ بہت کم آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ ایک طوفان کی مانند بپھر جایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کی یہ ہی کیفیت تھی۔ جبکہ مما سلیوز لیس نائٹی پر مہین سا گاؤن پہنے بڑے مطمئن انداز میں نیل پالش صاف کر رہی تھیں۔

گویا بھس میں چنگاری ڈال کر بھڑ بھڑ جلتی آگ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میں اسے روٹین کی کوئی چپقلش سمجھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ مگر اس کے بعد دو دن تک پاپا اس حد تک ٹینس رہے کہ مجھے ان کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے اور ڈپریشن ان کے لیے سخت نقصان دہ تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے اصل بات اگلوانے کی کوشش کی مگر وہ پُرخیال نظروں سے مجھے بس دیکھتے رہے کہا کچھ نہیں مگر یہ عقدہ بھی اس شام کھل ہی گیا۔ میں حسب عادت یونیورسٹی سے واپسی پر سو گئی تھی رات کو جب میری آنکھ کھلی تو پاپا کے بیڈ روم میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ دونوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"نجانے اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ اور یہ مما بھی کیسی ضدی ہیں۔ مجال ہے جو پاپا کی کوئی بات مان جائیں۔"

میں نے اکتا کر سوچا تھا اور پھر دبے پاؤں چلتی ہوئی بیڈ روم کے دروازے تک آئی تھی۔ فطری طور پہ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ آخر جھگڑا کس بات پر ہے۔

"آر یو میڈ فصیحہ تم جانتی ہو تمہارے اس فیصلے کا شانزے پر کتنا برا اثر پڑے گا۔"

"شانزے دودھ پیتی بچی نہیں ہے بڑی ہو چکی ہے برا بھلا سمجھ سکتی ہے وہ۔"

"یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں یہ ہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ وہ اب بڑی ہو چکی ہے ہم دونوں کو مل کر اس کے بارے میں سوچنا چاہیے تمہیں نہیں معلوم مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔۔۔ تمہارے اس فیصلے سے اسے کتنا دکھ ہو گا۔۔۔ یہ سوچا ہے تم نے؟" پاپا کہہ رہے تھے۔

"ایمان حسن۔۔۔ میرے پاس تمہاری فضول باتیں سننے کا بالکل وقت نہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے ڈائیورس چاہیے میں اب تمہارے ساتھ مزید گزارہ نہیں کر سکتی۔" مما نے کس مطمئن لہجے میں کہا تھا مگر میرے سامنے ہفت آسمان گھوم گئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں مما۔" میں ششدر سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

"مگر میرے جیتے جی یہ نہیں ہو گا۔" کچھ دیر خاموشی کے بعد پاپا کی سرد و سپاٹ آواز فیصلہ کن لہجے میں سنائی دی تھی۔ اس کے بعد مما نے نہ جانے کیا کہا تھا میں منہ پہ ہاتھ رکھے لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ مما کے چیخنے چلانے کی آوازوں نے کمرے تک میرا پیچھا کیا تھا۔ میں نے اپنے سائیں سائیں کرتے کانوں پر ہتھیلیاں رکھ لی تھیں۔ میرے اندر چھپی ہوئی بچی بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"کیوں کر رہی ہیں مما ایسا۔۔۔؟" میں نے بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔ پھر بیڈ روم سے اٹھنے والی آوازیں یکلخت ہی معدوم ہو گئی تھیں۔ میں کچھ لمحے یونہی بیٹھی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ یا تو پاپا اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو گئے ہوں گے یا مما گاڑی لے کر

باہر نکل جائیں گی۔ گاڑی چلنے کی آواز نہ آئی تھی۔
میں نے اپنے کمرے سے نکل کر اسٹڈی روم کی طرف دیکھا اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گویا پاپا بھی بیڈ روم میں ہی ہیں اور یہ بات باعث تشویش ہی تو تھی کہ اگر دونوں کمرے میں موجود تھے تو پھر یہ خاموشی کیا معنی رکھتی ہے۔ میں فوراً" بیڈ روم کے دروازے تک گئی تھی اور ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔ میری پہلی نظر مما پر پڑی تھی۔ وہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب تھیں۔ اور مسکرا رہی تھیں اور ان کی مسکراہٹ اس قدر زہریلی اور پراسرار تھی کہ میں نے بے ساختہ ہی مزید دروازہ کھول کر پاپا کو ڈھونڈنا چاہا تھا اور اگلا لمحہ میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ پاپا درد سے بری طرح بے حال ہوتے ہوئے بیڈ پر جھکتے جا رہے تھے۔ دایاں ہاتھ سینے پہ تھا جبکہ بائیں ہاتھ سے انہوں نے بیڈ شیٹ کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ گویا وہ بے حد اذیت میں تھے۔ میں چیخ کر ان کی طرف بڑھی تھی۔

"پاپا کیا ہو رہا ہے آپ کو؟" میں نے بمشکل انہیں کاندھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا تھا۔ تبھی مما بھی چلتی ہوئی میرے قریب آگئی تھیں۔

"مما۔۔۔" میں نے جیسے مدد کے لیے انہیں پکارا تھا۔ وہ بھی گھبرا کر پاپا پر جھکی تھیں مگر ان کی گھبراہٹ اس قدر مصنوعی تھی کہ میں پریشانی کے اس لمحے میں بھی محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ پاپا کی خراب ہوتی حالت دیکھ کر میں نے فوراً" سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر گولیوں کی وہ شیشی تلاش کرنی چاہی جو ایسے کسی بھی وقت کے لیے وہاں ہمیشہ موجود ہوتی تھی اور پاپا تکلیف محسوس کرنے پر وہ ٹیبلٹ زبان کے نیچے رکھ لیا کرتے تھے۔ دوسری، تیسری، چوتھی دراز بھی کنگھال لینے کے باوجود وہ شیشی مجھے نہ ملی تو میں ڈاکٹر کو کال کرنے کے لیے فون کی طرف لپکی تھی مگر جونہی میں مڑی تھی پاپا نے میری قمیص کا بازو کھینچ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ جیسے ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے۔ میں نے ان کے زرد ہوتے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

"پاپا۔۔۔ میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں۔" میرا دل ان کو تکلیف میں دیکھ کر کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں کانپتی آواز میں ان کو تسلی دے کر اٹھی تھی مگر میرے بازو پر ان کی گرفت ایک لمحے کے لیے بے حد مضبوط ہونے کے بعد اچانک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں نے انجانے خدشے سے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ مجھ پر جمی ان کی حسرت زدہ آنکھیں ساکت تھیں ان میں ہر جذبہ، ہر احساس دم توڑ چکا تھا۔ بس ان کی آنکھ کے بیرونی گوشے پہ ٹھہرا آنسو اس لمحے ٹوٹ کر ان کے بالوں میں جذب ہوا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ ایسے ان سے زندگی کا ناتا بھی ٹوٹ گیا ہے۔

میں اپنی جگہ پتھر کی ہو گئی تھی۔ ایسی انہونی ہوئی تھی کہ یقین کو سرا ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ میری موجودگی میں اپنی شانزے کی موجودگی میں یوں زندگی سے روٹھ جاتے مگر ایسا ہو چکا تھا۔۔۔ میرے پاپا میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ چکے تھے اور میں خشک آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ میں کچھ بھی نہ کر پائی ولید احتشام کچھ بھی نہ کر سکی" وہ لمحات وہ گھڑیاں یوں میری نظروں کے سامنے آئے تھے کہ ضبط کا یارا نہ رہا۔

میں یوں رو رہی تھی جیسے پاپا آج مرے ہوں ان کی میت میرے سامنے پڑی ہو اور میری بے بسی کا احساس مجھے آج کچوکے لگا رہا ہو۔ ولید احتشام بت بنا میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے غالباً" اس وقت مجھے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"پاپا کی وفات کو کئی روز ہو گئے نجانے دل کیسے پتھر ہوا تھا کہ میں رو بھی نہ سکی۔ وہ لمحے بار بار میری نظروں کے سامنے فلم کی مانند چلتے رہے۔ میں نے اتنے دن مما سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ان کی بے جا ضد کی وجہ سے ہی پاپا کی طبیعت اس حد تک خراب ہوئی تھی۔ اور پھر انہی دنوں جب میں بار بار اس واقعے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی کچھ سوال کانٹوں کی طرح ذہن کی سطح پر ابھرے اور مسلسل مجھے تنگ کرتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں

آتا تھا کہ اس وقت جب پاپا کی حالت اس قدر تشویش ناک ہو رہی تھی مما کھڑکی کے پاس کیوں کھڑی تھیں اور پھر وہ موقع مسکرانے کا تو نہیں تھا جب کہ میں نے مما کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو بخوبی دیکھا تھا۔

اور پھر میرے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی جیسے انہوں نے واجبی سے طریقے سے پاپا کو ٹریٹ کیا تھا۔ نہ پانی کا گلاس لیے پاپا کی طرف بڑھیں۔ نہ ڈاکٹر کو فون کرنے کی کوشش کی نہ کسی ملازم کو پکارا' یہ سب باتیں مجھے عجیب سے وہم میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اور یہ وہم ہی تھا جو ایک روز مجھے عقبی لان کی طرف کھینچ لے گیا تھا۔

پاپا کے بیڈ روم میں لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے عین نیچے کھڑے ہو کر میں نے یہاں پر موجود باڑھ کا جائزہ لیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ اور یونہی باڑھ کی جڑوں میں ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے کوئی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی تھی اور۔۔۔ معلوم ہے ولید احتشام وہاں سے کیا چیز برآمد ہوئی تھی۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ وہی شیشی تھی جس میں موجود ٹیبلٹس کی اس وقت پاپا کو ضرورت تھی اور جو ہمیشہ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں موجود رہتی تھی اس وقت میری سمجھ میں آیا تھا کہ مما کھڑکی کے پاس کیوں کھڑی تھیں۔ وہم یقین میں بدلا تھا اور میرے پاؤں تلے سے زمین بھی سرک گئی تھی۔ شک و شبے کی گنجائش موجود نہ تھی اس عورت نے اپنی خواہشات کی خاطر میرے پاپا کو مجھ سے چھین لیا۔ سن رہے ہو ناں ولید وہ بظاہر جو بے حد خوبصورت اجلے چہرے والی عورت ہے اس کا دل اتنا مکروہ ہے کہ اس نے مجھ سے میرے پاپا کو چھین لیا۔" میں نے پتھر بنے ولید احتشام کی بے یقین آنکھوں میں جھانک کر اس کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"وہ خود محبت کرنا نہیں جانتی تھی مگر اس نے اس شخص کو بھی مار ڈالا جو اس کائنات میں مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا جو مجھے دنیا کے ہر شخص سے زیادہ محبت دیتا تھا' اتنی محبت کہ آج تک کسی باپ نے اپنی بیٹی سے نہیں کی ہوگی۔ وہ مجھ سے کہا کرتے تھے۔

"شانزے جان' تم نہیں جانتیں تم میرے لیے کیا ہو؟ تم سورج کی اولین کرن بن کر میرے دن کا آغاز کرتی ہو۔

چاند کی روپہلی کرنیں جو رات کی قبا پر ستارے ٹانک دیتی ہیں وہ بھی تم ہو اور شانزے بہار کی آمد پر گلشن میں کھلنے والا پہلا پھول بھی تم ہی ہو۔

تم میرے لیے روشنی ہو' خوشی ہو' مسکراہٹ ہو' زندگی بھی ہو" بتاؤ ولید احتشام کبھی کسی نے اپنی اولاد سے اس حد تک بھی پیار کیا ہوگا اور یہ پیار مجھ سے چھین لیا گیا اور مجھ پر ظلم کرنے والا کوئی اور نہیں میری اپنی ماں تھی۔۔۔ جس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔ اور ماں تو بچے کے لیے دنیا میں بڑی سے بڑی قربانی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک چڑیا بھی اپنے بچوں کو موسموں کی آفت سے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے۔ پھر یہ کیسی ماں تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں میرے سر سے آسمان کھینچ لیا۔ مجھے بڑی آسانی سے خزاں کی آغوش میں ڈالا اور خود بہار کی رنگینیوں میں کھو گئی۔"

روتے روتے میری آواز پھٹ گئی تھی۔ اور میں گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسک پڑی تھی ولید احتشام اس انکشاف پر سانس روکے بیٹھا تھا اور پھر نجانے کتنی دیر بعد اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔

"شانزے۔۔۔ میرا خیال ہے اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"پھر اس کے بعد جب کائنات کے ہر رشتے پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا تھا تب وہ سر راہ مجھے ملا تھا بنز آنکھوں میں امید کے دیپ جلائے' کسی روشن صبح کی مانند تابناک۔۔۔ اسے دیکھ کر بے یقینی کی دھند رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔ بے اعتباری کا موسم میرے وجود پر سے گزرتا چلا گیا' مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے اردگرد بکھرے خود غرض لوگوں کے علاوہ کچھ ایسے جانثار بھی موجود ہیں جو ہنستے ہیں تو دوسروں کی خاطر جو روتے ہیں تو دوسروں

کے دکھ پر۔"
وہ مجھے جینے کا ہنر سکھانے لگا۔ نم آنکھوں سمیت مسکرانے کا سلیقہ دیا۔ وہ مجھے کسی دیوتا کی طرح عظیم لگنے لگا تھا۔ جس کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنا سر اونچا کرنا پڑتا تھا اور پھر یہ دیوتا اپنے اصل روپ کے ساتھ سامنے آیا تو میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔" میں نے طویل سانس لے کر ولید احتشام کو دیکھا۔

"ولید۔ کیوں کرتے ہیں لوگ ایسا۔۔۔ اپنی ظاہری شخصیت میں جس قدر بلند نظر آتے ہیں درحقیقت اتنے ہی پست کیوں ہوتے ہیں۔

میری ماں اپنے حلقہ احباب میں ایک پرخلوص عورت کے طور پر پہچانی جاتی ہے اس نے تو ایک شخص کو قتل کیا ہے اور وہ۔۔۔ جو سینکڑوں بچوں کا "آفندی بابا" تھا' وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے' آخر ہم لوگ کیسے قتل کر دیتے ہیں۔ انسانوں کو۔

کسی کی مسکراہٹ کو
دوسروں کی خوشیوں کو
اعتبار کو
مان بھرے رشتوں کو
دوسروں کی محبتوں کو
توقعات کو
توقعات کو۔۔۔

ولید احتشام کیا مار ڈالنا' ختم کر دینا اتنا ہی آسان ہے؟"

میں نے ایک ناقابل فہم نا سمجھ میں آنے والا سوال اس کے سامنے رکھا تھا۔ جس کا جواب شاید اس کے پاس بھی نہیں تھا اسی لیے نظریں چرا کر طویل سانس لیتے ہوئے میرا ہاتھ تھپتھپا کر کہا تھا۔

"تم بہت تھک گئی ہو شانزے تمہیں اب نیند کی ضرورت ہو گی۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا میں نے اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس کیا تو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی۔ اور بہت دنوں بعد اس روز نیند کے دوران خوفناک چہرے مجھے ڈرانے نہیں آئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥
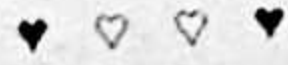
"تھینک گاڈ' تم بستر سے تو اٹھیں۔" پھپھو کی خوشی سے معمور آواز سنائی دی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اس وقت لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں نرم دھوپ اپنے سنہری پر پھیلائے ہوئے تھی۔ لیمن گراس کی خوشبو ہوا میں رچی بسی ہوئی تھی۔

اورنج ساڑھی میں پھپھو جاندار مسکراہٹ لیے میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

"میں تو بستر کو چھوڑ رہی تھی مگر بستر مجھے نہیں چھوڑ رہا تھا۔۔۔" میں نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"دنیزہ کیسی ہے' اس کا فون نہیں آیا؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے' فون بھی کئی مرتبہ کر چکی ہے' انجوائے کر رہی ہے وہاں پر' تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر میں نے اسے یہ ہی کہا تھا کہ تم آج کل شہر سے باہر ہو' تمہیں تو معلوم ہے ناں وہ تم سے کتنی اٹیچ ہے اگر ذرا سی خبر بھی ہو جاتی کہ تم بیمار ہو تو وہاں اس نے آسمان سر پر اٹھا لینا تھا اب تم ٹھیک ہو تو خود اس سے بات کر لینا۔" انہوں نے وضاحت سے بتایا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب تو تم ٹھیک ہو ناں شانزے؟" انہوں نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی پھپھو۔۔۔ ناؤ آئی ایم پرفیکٹ۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"چندا تم کیوں اتنا ڈپریسڈ رہتی ہو آخر وجہ کیا ہے؟" انہوں نے ہاتھ تھام کر ملائمت سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے تم ابھی تک ایمان حسن کی موت کے صدمے سے باہر نہیں نکل سکیں بلاشبہ وہ ایسا ہی انسان تھا مگر جانو کہہ سن لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے فصیحہ سے نہیں کہنا چاہتیں تو مجھ سے کہہ لیا کرو آخر میں بھی تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔"

ہاسپٹل میں وہ مما کے ساتھ میرا نفرت بھرا گریز جان گئی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے خود میرے دل میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔

ان کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے بات بدل دی تھی۔

"پھپھو۔۔۔ میں آپ کی طرف آنا چاہتی ہوں۔"

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر خوشدلی سے مسکرا دیں۔
"ٹھیک ہے، تم جب چاہو آجانا' دنیزہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے گھر کافی سونا ہو گیا ہے تمہارے ساتھ ہمارا دل بھی بہلا رہے گا۔"
"میں آج ہی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔"
"ٹھیک ہے، مگر میں ذرا فصیحہ سے مل آؤں' گھر پر ہی ہے وہ؟"
"معلوم نہیں" میں نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ اندر کی جانب بڑھ گئیں' جب کہ میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔
"بہت سے رشتے میرے اردگرد موجود تھے مگر میں دل کی بات کہنے سے گریز کرتی رہی حتیٰ کہ دنیزہ سے بھی نہیں کہ جو بچپن سے میری سنگی ساتھی ہے۔ تو آخر میں نے کبھار کس کے لیے اس شخص کو ہی کیوں چنا جس سے میرا کوئی خاص رشتہ نہیں' تعلق نہیں بلکہ کسی حد تک وہ ناپسندیدگی کے زمرے میں ہی آتا تھا پھر...؟" میں نے گویا خود سے سوال کیا۔
"شاید اس وقت میں بہت زیادہ تھک گئی تھی' اس راز کو چھپانے کی کوشش میں نڈھال ہو کر رہ گئی تھی۔ اور کسی کمزور لمحے کی زد میں آکر بکھرتی چلی گئی اور اس کے سامنے خود کو کھول کر رکھ دیا۔"
میں اپنے خیال سے اس وقت چونکی تھی جب پھپھو نے قریب آکر مجھے پکارا تھا۔ میں جھٹ کرسی سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لی تھی۔
پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہی میری نظر اخبار پر پڑی تھی۔ غالباً "داور انکل پڑھنے کے بعد گاڑی میں ہی چھوڑ گئے تھے۔ میں نے سرسری سی نظر فرنٹ پیج پہ ڈالنے کے بعد پلٹتی رہی تھی اور آخری صفحے پر خبر کے ساتھ لگی تصویر پہ میری نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ دل ایکدم سکڑ کر پھیلا تھا۔ پولیس کے نرغے میں عدالت کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے جمشید آفندی کی تصویر تھی۔ ہلکی سی شیو بڑھی ہوئی تھی اور سر جھکا ہوا تھا۔
اور مجھے یاد آیا کہ اس کا سر تو ہمیشہ ہی جھکا رہتا تھا۔ میں نے کبھی اسے سر اٹھا کر چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظر ہمیشہ اس کے اپنے قدموں پر رہتی تھی یوں جیسے وہ گن گن کر قدم اٹھا رہا ہو۔
"اور نجانے کیوں یہ سب کچھ دیکھ لینے کے باوجود بھی مجھے لگتا ہے کہ تم بالکل بے گناہ ہو۔"
میں نے اس کی تصویر پر ہلکا سا ہاتھ پھیرا تھا اور وہ آن کی آن میں اپنے ساحر سراپے سمیت میری آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔
"مس شانزے... چھوٹی چھوٹی باتوں کو پروا کرنا چھوڑ دیں' خوش رہا کریں۔" اس نے آخری مرتبہ تاقین کی تھی۔
"کیسے انسان تھے تم... خوشیاں بھی جی بھر کر بانٹیں اور دکھ دینے میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔" میں نے دل ہی دل میں اس سے شکوہ کیا تھا۔
"کاش میں صرف ایک بار تم سے مل سکتی۔ بہت کچھ پوچھنا تھا تم سے ابھی بہت سے جواب تمہارے ذمے تھے... کاش۔" میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا اور گاڑی سے باہر بھاگتی دوڑتی عمارتوں پر نظر ٹکا دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
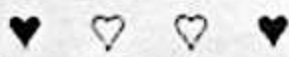
میں جوگرز پہن کر پھپھو کو بتا کر پیدل ہی گیٹ سے باہر آگئی تھی۔ آج یونہی چہل قدمی کو دل چاہ رہا تھا سو دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میں کالونی کی سڑکوں پر ہی ٹہلنے لگی تھی۔ رہائشی علاقہ تھا سو رش وغیرہ بالکل نہیں تھا۔ ایک دو مرتبہ پاس سے بھاگتے ہوئے بچے ہیلو کے انداز میں ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ گئے تھے۔ میں یونہی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہی تھی جب اچانک کوئی میرے بالکل برابر آگیا تھا۔ میں نے بے اختیار ہی گردن موڑ کر دیکھا تھا۔
"ہیلو... میں گھر گیا تو آنٹی نے بتایا تم واک کرنے نکلی ہو سو میں بھی پیچھے چلا آیا تھا۔" یہ ولید احتشام تھا اپنے مخصوص انداز میں بولتا ہوا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھ کر نظروں کا زاویہ بدل دیا تھا۔
"ہاں بس ایسے ہی باہر نکلنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے چلی آئی۔" میں نے محسوس کیا تھا کہ اب پہلے کی طرح اس شخص کو نظرانداز کر دینا میرے لیے ممکن نہ رہا تھا

کہ نادانستگی میں ہی سہی بہرحال وہ میرا رازدار بن چکا تھا۔

"گھر کب چل رہی ہو۔"

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" میں رک کر ایک کوٹھی کی دیوار سے باہر لٹکتے سفید پھولوں کا گچھا توڑنے لگی تھی۔

"اچھا۔۔۔ ویسے ڈیڈی بھی تمہیں مس کر رہے تھے۔ انہوں نے دانستہ خود کو اور مما کو تمہارے سامنے آنے سے روک رکھا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم انہیں ڈس لائک کرتی ہو مگر شانزے جی۔۔۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ اتنے نائس مین کو ڈس لائک کیسے کر سکتی ہیں؟"۔

"اگر میں اپنی ماں سے نفرت کر سکتی ہوں تو کسی دوسرے فرد کو ناپسند کرنا ناممکن بات تو نہیں۔" پھول توڑنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے میں نے چڑ کر کہا۔

"ماما سے نفرت کا تو ایک ٹھوس جواز ہے اگرچہ اس پر یقین کرنا کوئی آسان کام نہیں۔" اس نے میرے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر ذرا سی کوشش کے بعد پھول توڑ کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"مگر میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ بات تم نے کہی ہے کیونکہ ماں کا رشتہ ایسا نہیں ہوتا کہ محض شک وشبے کی بناء پر اتنا بڑا الزام اس کے سر لگا دیا جائے۔ مگر ڈیڈی کے ساتھ تمہارا رویہ میرے سمجھ سے باہر ہے۔"

"مسٹر دلید احتشام یا تو آپ بہت معصوم ہیں یا پھر بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے قدرے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"غالباً" میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اس روز جھگڑے کی بنیاد مما کا طلاق کا مطالبہ تھا۔ اور پاپا کی وفات کے محض دو ماہ بعد انہوں نے احتشام احمد سے شادی کر لی۔ گویا وہ ان کی وجہ سے پاپا سے طلاق چاہتی تھیں اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پاپا کو مارنے کا پروگرام ان دونوں نے مل کر بنایا ہو۔"

میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے غالباً" یہ بھول گئی تھی کہ میں اسی شخص کے بیٹے سے مخاطب ہوں جس پر قتل کا الزام لگا رہی ہوں۔

"واٹ۔۔۔اے جسٹ۔۔۔ آفٹ۔" وہ ایکدم میرے سامنے آگیا تھا۔

"تم بہت غلط سوچ رہی ہو' اگر یہ ان دونوں کی ملی بھگت ہوتی تو واقعے کی نوعیت کچھ اور ہوتی۔ جو کچھ تمہاری مما نے کیا وہ شدید غصے میں ایک اضطراری حرکت اور فوری ردعمل کے سوا اور کچھ نہیں اور میرا تو خیال ہے شدید غصے میں ان کا دماغ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا ہو گا ورنہ ڈائیورس عدالت کے ذریعے باآسانی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس کے لیے کسی شخص کو مارنا ضروری نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات ہے۔ جو میرا خیال ہے وہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔" وہ ایک گھر کے سامنے بنے گھاس کے سبز قطعے کی طرف بڑھا تو میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

"بات یہ ہے شانزے۔۔۔" وہ بہت اطمینان سے گھاس پر براجمان ہوا تھا۔

"کہ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا' خاندان بھر نے ڈیڈی پر دوسری شادی کے لیے زور دیا مگر ڈیڈی نہ مانے اور مجھ سمیت اس ملک سے ہی نکل بھاگے' ایک طویل عرصے بعد جب ڈیڈی کو وطن اور اپنے لوگوں کی یاد آئی تب ہم سارا بزنس وائنڈ اپ کر کے یہاں آگئے اور جب ہم لوگ یہاں آئے تھے اس وقت یہ خبر ہر طرف گردش کر رہی تھی کہ "شان انڈسٹریز" کے اونر ایمان حسن وفات پا چکے ہیں۔ اور پھر پورے ایک ماہ بعد ایک رات انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مشہور بزنس مین ایمان حسن دو ماہ قبل وفات پا گئے تھے اور ان کا قابل اعتماد منیجر جو گزشتہ آٹھ دس سال سے ان کے ساتھ کام کر رہا تھا اس موقع پر کروڑوں روپے ہتھیا کر اپنے بیوی بچوں سمیت اس ملک سے فرار ہو چکا ہے۔ ایمان حسن کی بیوہ اور ان کی بیٹی اس وقت کرائسس میں ہیں۔ ڈیڈی نے کہا تھا وہ فصیحہ بیگم اور ان کی بیٹی کو نہ صرف مالی بلکہ جذباتی سہارا بھی دینا چاہتے ہیں"

ایک طویل عرصہ تنہا رہنے کے بعد اگر ڈیڈی نے ایسی کوئی خواہش کی تھی تو ظاہر ہے مجھے اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا سو میں نے ان کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اور اس طرح یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ تمہاری مما نے جو کچھ کیا اس میں ڈیڈی کسی طرح سے بھی انوالو نہیں تھے انہوں نے تو بہت خلوص اور ایمانداری سے تم دونوں کا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔ کیا ہوا کیا میری بات پر یقین نہیں آرہا؟" بات کے اختتام پر اس نے میری حیرت سے کھلی آنکھوں میں جھانکا۔

"اگر تمہیں میری کوئی بات ناقابل یقین لگے تو تم کسی سے بھی اس کی تصدیق کر سکتی ہو دنیزہ سے 'آنٹی سے' داور انکل سے یا آفس کے کسی بھی ورکر سے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔"

اور میں کسی سے تصدیق کیا کرواتی میرا تو یہ سن کر ہی سر جھک گیا تھا کہ جس دولت کو میں باپ کی کمائی سمجھ کر اڑا رہی تھی وہ درحقیقت اس شخص کی ہے۔ جس کی ہر محبت کے جواب میں میں نے نفرت جتائی تھی۔

"اور پلیز۔۔۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر کوئی احسان جتانے کی کوشش کر رہا ہوں اپنی اور ڈیڈی کی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے مجھے یہ فیکٹ تمہیں بتانا پڑا۔" وہ ایک اچھے دوست کی طرح میری دلجوئی کر رہا تھا۔

"اب چلیں واپس۔۔۔؟" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے مجھے چونکایا تو میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے' اتنی خاموش کیوں ہو گئی ہو؟" اس نے قدرے جھک کر میرا چہرہ کھوجا۔

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارا کاروبار بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا یا پھر مکمل طور پر ڈوب گیا تھا اور میرے ڈیڈی نے اسے کنارہ دیا تھا بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ مینجر کروڑوں روپے لے کر بھاگ گیا تھا اور باقی جو کروڑوں روپیہ کاروبار میں لگا ہوا تھا ڈیڈی نے اسی میں کچھ انویسٹمنٹ کی تھی۔ آج سارا کاروبار ففٹی ففٹی کی بنیاد پر چل رہا ہے اور اتنا ہی تمہارا ہے جتنا ہمارا۔" اس نے دل میں گڑا آخری کانٹا بھی بڑے سبھاؤ سے نکالا تھا۔

"کوئی اور بات کھٹک رہی ہے تو بلا جھجک کہہ ڈالو' بیلیو می' میرے پاس تمہارے ہر سوال کا جواب موجود ہو گا۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا اور میں نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی میری نظر مما پر پڑی تھی جو پھپھو کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھیں' میں نے انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا مگر وہ فوراً اٹھ کر میری طرف بڑھی تھیں۔

"شانزے۔۔۔ ڈیئر۔۔۔ لسن می پلیز۔"

"ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ میں ان سے بات نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے ناگواری سے کہا تھا۔ ولید راستے میں ہی رک کر انہیں دیکھنے لگا تھا مگر وہ نظر انداز کر گئی تھیں۔ انہیں بے تابانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میرے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔ اور پھر تقریباً بھاگ کر میں برآمدے سے ہوتی ہوئی کمرے میں آ کر بند ہو گئی تھی۔

✈ ✈ ✈ ✈

پرندے لوٹ آئیں۔۔۔ تو
کسی دن پوچھنا ان سے
کہ اپنے گھونسلے سے پابرہنہ
اور ننگے سر نکلنے سے
اماں اور عافیت کا
کوئی اک دروازہ کھلنے تک
کہو کتنے زمانے
اور کتنے فاصلے درپیش ہوتے ہیں
کبھی زخمی پروں والے پرندے
لوٹ آئیں تو
یہ ان سے پوچھنا
بولو!
ہوا کے سنگدل دریا کی
خوں آشام لہروں میں
تم اپنے پنکھ چپو
کس طرح حرکت میں رکھتے تھے
کبھی یہ پوچھنا ان سے

کہ جب تم آگ برساتے ہوئے سورج کی
تپتی زد پہ ہوتے تھے
تو پھر تم اپنے جسموں کو
لہو کی کون سی برفاب قوت کے سہارے
سرد رکھتے تھے
پرندے لوٹ آئیں تو
کسی دن پوچھنا ان سے
مگر ٹھہرو
کسے معلوم جانے والے اپنی واپسی پر
کس قدر مختار ہوتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو کہ لوٹنے سے قبل
ان صابر پرندوں کا
کسی دم
خاک و خوں میں لوٹنا مقسوم ٹھہرا ہو
تو پھر سوچو
کہ تم یہ ساری باتیں
کس سے پوچھو گے

جمشید آفندی کا خط میرے سامنے کھلا پڑا ہے اور آنسو لکیر کی صورت میرے گالوں پر بہتے چلے جا رہے ہیں۔ آج مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ چلتے ہوئے ہمیشہ اس کا سر جھکا کیوں رہتا تھا۔

جب لوگ جھولیاں پھیلا پھیلا کر اسے دعائیں دیتے تھے تو سبز آنکھوں میں ایک اضطراب سا کیوں چھلکنے لگتا تھا۔

نیکی اور فلاح کے ڈھیروں کام کرنے کے باوجود وہ مطمئن کیوں نہیں ہوتا تھا۔

اور آج مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ مستان شاہ کون تھا آفندی کا اس کے ساتھ کیا تعلق تھا۔

اور مستان شاہ کے ساتھ برہنہ پا' ہاتھ میں کشکول لیے بھیک مانگنے والا بچہ کون تھا۔

میں نے خط دوبارہ پڑھنے کے بعد تہ کر لیا تھا اور اپنے آنسو ہتھیلی سے پونچھ ڈالے تھے۔

"اور وہ بے گناہ ہی تو تھا۔۔۔ نجانے کتنے جمشید آفندی اس سسٹم کا شکار ہو کر سزاوار ٹھہریں گے۔"

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو عاصم آیا تھا وہ بہت غمگین لگ رہا تھا۔

"اخبارات آفندی صاحب کے خلاف زہر اگل رہے ہیں ہر کوئی انہیں تضحیک کا نشانہ بنا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں ان کا دل آج بھی اتنا ہی خوبصورت ہے' میری نظر میں وہ آج بھی اتنے بلند ہیں جتنے پہلے تھے' یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ اپنی معصومیت میں وہ ایک ایسی دلدل میں دھنس گئے تھے کہ جس میں سے نکلنے کی کوشش میں وہ مزید اندر دھنستے چلے گئے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں مس شانزے ایمان کہ انہوں نے دوسروں کے لیے جو بھی کام کیا اس میں ذرہ بھر کھوٹ نہیں تھی۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیے وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

"کیا ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے عاصم۔" میں نے نجانے کس امید کے تحت اس سے پوچھا تھا وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا تھا۔

"نہیں مس شانزے وہ اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقرار کر چکے ہیں انہوں نے ہر اس فرد کو عیاں کیا ہے جو اس کاروبار میں ان کے ساتھ شریک تھا اور جن پر ہاتھ ڈالنے سے قانون ڈرتا تھا۔"

"اور "دارالاطفال۔۔۔" وہاں کے سب بچے" میرا دل بھر آیا تھا اس بھرے پرے دارالاطفال کو یاد کر کے۔

"آپ بے فکر رہیے انشاء اللہ بہت جلد پرندے اپنے آشیاں میں لوٹ آئیں گے۔"
اس نے امید بھرے لہجے میں کہا تھا اور میں نے دل ہی دل میں پوری شدت سے "آمین" کہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
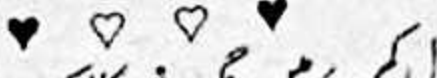
ہال کمرے میں رنگ و نور کا ایک سیلاب سا امڈا ہوا تھا۔ فانوس کی تیز روشنی میں خواتین کے چہرے دمک رہے تھے۔ اپنی ذات اور زیبائش کی نمائش میں ایک دوسرے کو مات دیتی ہوئی خواتین حسن و نزاکت کے مجسموں کی صورت اپنی اپنی جگہ ایستادہ تھیں۔ باتوں کی بھنبھناہٹوں کے درمیان کبھی کبھار کوئی ہلکا سا

نسوانی قہقہہ ماحول کے ہلکے پھلکے ارتعاش میں بہت تیس سی ہلچل مچا دیتا تھا۔ مرد حضرات ایک دوسرے کی کاروباری مصروفیات کو جاننے اور توہ لینے میں منہمک تھے۔ کون نئی انڈسٹری لگا رہا ہے؟ کس نے ٹیکس جمع کروایا؟ اور کس کا دھندا آج کل مندا جا رہا ہے؟

میں ہال کے ایک کونے میں کھڑی یہاں موجود ایک ایک فرد کا بھرپور جائزہ لے چکی تھی۔ اور بوریت کی آخری منزل تک پہنچی تھی۔

کتنا منع کیا تھا میں نے پھپھو کو مگر ان کی خواہش تھی کہ میرے صحت مند ہونے کی خوشی میں ایک زبردست قسم کی پارٹی دی جائے۔۔۔ **نتیجتاً** "چہرے پہ صحت مندی کا تاثر دیتی بھرپور مسکراہٹ سجاتے سجاتے میں تھک گئی تھی۔

کتنا مصنوعی پن تھا اس سارے کے سارے ماحول میں۔ میں نے چڑ کر بڑے سے بلیک دوپٹے کو بمشکل کندھے پہ سیٹ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرسراتے ہوئے ریشمی آنچل
کافی اور سگار کی ملی جلی خوشبو
طرح طرح کے پرفیومز
امپورٹڈ جیولری

اس سارے ماحول میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں باہر جانے کے لیے صوفوں کی عقبی سائیڈ سے گزر رہی تھی جب اچانک مما میرے سامنے آگئی تھیں۔

"شانزے پلیز کچھ دیر رکو۔" انہوں نے میرا بازو تھام کر مجھے روک لیا تھا۔

"آخری مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ۔۔۔؟" میں نے سرسری سی نظر اطراف میں ڈالی اور کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر کسی قدر اطمینان محسوس کیا تھا۔

"تم۔۔۔ تم گھر کب آ رہی ہو۔۔۔ دیکھو اتنے دن ہو گئے تمہیں یہاں آئے ہوئے اور اصولاً "تو یہ پارٹی بھی ہمیں اپنے گھر میں ارینج کرنی چاہیے تھی۔ آخر سب لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔"

انہوں نے عجلت بھرے انداز میں کہا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے انہیں غور سے دیکھا انہوں نے آئی لائنر اور مسکارے سے بجی آنکھیں چرا لی تھیں۔

"میرا خیال ہے لوگوں کے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہوتا کہ وہ ان چھوٹی موٹی باتوں کی پروا کرتے پھریں اور یوں بھی میں یہاں بہت خوش ہوں۔۔۔" میں نے انہیں پیچھے ہٹا کر آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر انہوں نے میرا بازو جیسے دبوچ لیا تھا۔

"احتشام شامی۔۔۔" انہوں نے فوراً "پلٹ کر احتشام احمد کو پکارا تو میں دانت پیس کر رہ گئی۔

"آپ خوامخواہ کیوں یہاں تماشا بنا رہی ہیں۔" میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"احتشام اسے کہو ناں اب گھر واپس چلے۔" انہوں نے ملتجی لہجے میں کہا تھا انہوں نے حیرت سے ایک نظر مما پر ڈالی اور دوسری مجھ پر پھر خوشدلی سے مسکرا دیئے۔

"بھئی کہنے کی کیا ضرورت ہے جب ہماری بیٹی کا دل چاہے گا تب آجائے گی۔" انہوں نے جیسے میرا موڈ درست کرنے کی کوشش کی اور پھر مما کو دوسری طرف متوجہ کیا۔

"وہ دیکھئے ناں **فصیحہ**۔۔۔ مسز شہریار آپ کو بلا رہی ہیں۔"

مما مجبوراً "ہونٹ کاٹتی ہوئی اس طرف چل دی تھیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"ان فیکٹ ہم دونوں تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔۔۔ گھر پہ تو تم پہلے بھی کم ہی نظر آتی تھیں مگر پھر بھی یہ احساس تو رہتا تھا کہ تم گئی ہو اور تمہیں لوٹ کر آنا بھی ہے۔۔۔ بہرحال میں مجبور نہیں کروں گا۔ جب دل چاہے چلی آنا۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے ہولے سے میرا سر تھپتھپایا تھا اور میں نے شاید پہلی مرتبہ ان کے لہجے کی شفقت کو محسوس کیا تھا۔ جبھی میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور پھر ان کے قریب سے ہو کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔

"اف۔۔۔" باہر کے کھلے ماحول میں آ کر میں نے کھل کر سانس لیا تھا اور ہائی ہیل کے سینڈلز اتار کر شبنمی گھاس پہ چلتی ہوئی لان کے بالکل آخری کونے

میں آگئی تھی۔
یہاں کا ماحول اندر کی نسبت بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ چاند کی چودھویں رات تھی اور بے حد اجلی نکھری چاندنی میں گھاس پر پڑے شبنم کے قطرے موتیوں کی صورت چمک رہے تھے۔ ہوا میں سبز گھاس کی مہک اور بہت سے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ موسم بہت خوشگوار اور ہوشربا تھا۔ ہال کمرے میں باتوں اور مدہم موسیقی کی آواز مجھے یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ ٹیوب لائٹس کی سفید دودھیا روشنی شفاف دریچوں سے باہر آنے کو بے تاب تھی ۔میں نے آنکھیں بند کرکے اس ماحول کو پوری طرح محسوس کرنا چاہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد قریب ہی کوئی آہٹ ابھری تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ دونوں ہاتھوں میں مگ لیے اسی طرف آرہا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں اس کا دراز قد خنک چاندنی میں بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔
"اتنی الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہو؟" اس نے قریب آکر کافی کا مگ میری طرف بڑھایا۔
"بس یونہی ۔۔۔ وہاں سخت بور ہو رہی تھی میں۔" میں نے ایک نظر کافی سے اڑتی بھاپ کو دیکھا۔
"حالانکہ یہ پارٹی صرف تمہارے لیے دی گئی ہے۔"
"ہاں مگر مجھے اس قسم کی پارٹیز بالکل بھی اٹریکٹ نہیں کرتیں۔" میرے لہجے میں خود بخود اکتاہٹ غالب آگئی تھی۔
"اچھا ۔۔۔ پھر کیا اٹریکٹ کرتا ہے تمہیں۔" اس کے انداز میں خاصی دلچسپی تھی۔
"مجھے ہر وہ چیز پسند ہے ولید احتشام جو فطرت سے بے حد قریب ہو بالکل خالص پاک کسی بھی کھوٹ اور ملاوٹ سے مبرا۔"
"مثلاً ۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔
"مثلاً" ننھے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اور ان کے چہروں پہ ثبت بے ریا مسکراہٹ۔ مجھے بے حد اٹریکٹ کرتی ہے۔
اور۔
ابھرتی ہوئی صبح مجھے بہت پسند ہے۔
پھولوں سے مجھے عشق ہے۔
خوشبوؤں کی میں دیوانی ہوں۔
چاندنی رات کا حسن مجھے اپنے طلسم میں جکڑ لیتا ہوں۔
اور۔
سیاہ رات کے سینے پر جگر جگر کرتے چاند سے مجھے بے حد محبت ہے۔"
میں نے ایک جذب کے عالم میں سر اٹھا کر آسمان پر روشن چاند کو دیکھنا چاہا میری نظریں عین ولید احتشام کے چہرے پہ جاکر ٹھہر گئی تھیں۔ چاند اس کے لمبے چوڑے وجود کے پیچھے چھپ کر رہ گیا تھا اور چاندنی اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
"آہم ۔۔۔ محترمہ آپ شاید بھول رہی ہیں میرا نام ولید احتشام ہے۔" اس نے ہلکا سا کھنکار کر شرارت سے کہا تو میں مسکرائے بناء نہیں رہ سکی تھی۔
"سب کچھ تو تم نے کہہ دیا مگر ایک بہت اہم چیز تم بھول رہی ہو ۔۔۔" اس کے کہنے پر میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی اور پھر استفسارانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
"انسان ۔۔۔ اس کائنات کی اہم ترین مخلوق ۔۔۔ جو بیک وقت چاہنے اور چاہے جانے کے لیے انتہائی موزوں ہستی ہے ۔۔۔" اس کی یاد دہانی پر میں سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔
"خاصے خوش فہم لگتے ہیں آپ ۔۔۔" میرے لہجے میں خود بخود طنز کی آمیزش ہو گئی تھی۔
"اس انتہائی موزوں ہستی کو خوب پرکھ چکی ہوں میں ۔۔۔ دھوکا' فریب' ریاکاری' دوغلاپن' مفاد پرستی ۔۔۔ ہر چیز اندازے سے بڑھ کر پائی ہے میں نے اس سانس لیتے پتلے سے ۔۔۔" میرے تجربات کا زہر میرے الفاظ میں گھلا ہوا تھا۔
"نہیں شانزے ۔۔۔" اس نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے فوراً" میری بات کو رد کیا تھا۔
"محض دو انسانوں کے تناظر میں تم پوری انسانیت کو جاننے اور پرکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ہاں یہ

تمہاری بد قسمتی تھی کہ تمہیں پے در پے ان دو واقعات کا سامنا کرنا پڑا جن کے ذمہ دار افراد تمہاری زندگی میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ مگر ان دو افراد کی وجہ سے تم ان تمام اچھے انسانوں سے صرف نظر نہیں کر سکتیں۔ جو آج بھی تمہارے اردگرد موجود ہیں۔ مثلاً" "دارالاطفال" کے باقی تمام ورکرز یونیورسٹی میں تمہارے دوست ونیزہ اور آنٹی جیسے رشتے دار۔"

"یہ سب لوگ اسی لیے اچھے ہیں کہ ابھی ان کی شخصیت کا پردہ چاک نہیں ہوا۔۔۔ ان کے چہروں پر نقاب جوں کے توں موجود ہیں کل یہ لوگ کس چہرے کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں گے۔ یہ ہم آج نہیں جان سکتے۔"

میں بے اختیار ہی اسے ٹوک بیٹھی تھی۔ میری بات پر اس کے چہرے پہ ناگواری کا ہلکا سا تاثر ابھر آیا تھا۔

"دیکھو شانزے انسان کوئی کمپیوٹر نہیں کہ کھٹا کھٹ وہی جذبات ظاہر کرے جو ہم لوگ چاہتے ہیں ۔۔۔ ہر بات پر وہی رسپانس دیں جو ہماری ڈیمانڈ ہے۔

انسان کے سینے میں دل بھی ہے اور سر میں دماغ بھی اور اس دل و دماغ میں وہ منفی و مثبت سوچ بھی رکھتا ہے اور اسی لحاظ سے وہ عمل بھی کرتا ہے اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم دوسروں کی منفی سوچ کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں یا اسی منفی سوچ سے کوئی پلس پوائنٹ اخذ کرتے ہیں تم نے خود پر حد درجہ مایوسی اور قنوطیت طاری کر لی ہے۔ جو کہ بالکل غلط بات ہے۔۔۔ اپنے آس پاس بکھرے لوگوں کو غور سے دیکھو ان کو پہچاننے کی کوشش کرو کون غلط ہے کون درست۔۔۔ اس کا فیصلہ تمہارا دل کرے گا۔۔۔ آج یا کل کا انتظار کیے بغیر۔۔۔ اوکے۔۔۔" اس نے اپنی بات ختم کر کے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اب میں چلتا ہوں۔۔۔ مگر تم میری بات پر غور ضرور کرنا۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

وہ اٹھ گیا تھا اور میں اس کی باتوں کو "فضول" قرار دیتے ہوئے بچی کھچی کافی حلق میں انڈیلنے لگی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
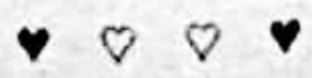
"بھئی کل حماد کی والدہ نے تو مجھے اچھا خاصا پریشان کر کے رکھ دیا۔" ناشتے کی میز پر پھپھو نے کہا تو میرے ساتھ ساتھ داور انکل بھی چونک گئے۔

"کیوں کیا ہوا؟" انکل نے اخبار ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کہہ رہی تھیں کہ ان کی ساس یعنی حماد کی دادی کی طبیعت کافی خراب رہنے لگی ہے اور وہ اس بات پر اصرار کر رہی ہیں کہ جلد از جلد ان کے اس چھوٹے اور لاڈلے پوتے کے سر پہ سہرا سجا دیا جائے اور حماد کی والدہ اس بات پر مصر تھیں کہ ہم شادی کے بارے میں ذرا سنجیدگی سے غور کریں تاکہ وہ اپنی بہو کو اپنے گھر لے جا سکیں۔"

"ہاں تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔ ونیزہ ہمارے پاس ان کی امانت ہی تو ہے۔۔۔ جب چاہیں لے جائیں۔" پھپھو کی بات کے اختتام پر انکل نے نہایت مطمئن انداز میں کہا تو وہ گہری سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔۔۔ بھئی اس کا ماسٹرز ادھورا رہ جائے گا۔۔۔ اتنی جلدی ہم کیسے کر سکتے ہیں اس کی شادی۔۔۔" میری طرف سے کوئی رسپانس نہ پا کر وہ دوبارہ انکل کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"لیلیٰ بیگم۔۔۔ وہ کوئی بیک ورڈ فیملی تو ہے نہیں۔۔۔ شادی کے بعد ماسٹرز تو کیا پی ایچ ڈی بھی کی جا سکتی ہے ۔۔۔ کیوں شانزے۔۔۔۔۔؟"

انہوں نے نیپکن سے منہ اور ہاتھ صاف کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"اس سلسلے میں ونیزہ کی رائے زیادہ اہم ہے انکل اور اس کے بعد جو آپ چاہیں مگر ایک بات ہے کہ اگر حماد کی دادی محترمہ کی زندگی میں یہ خوشگوار واقعہ ہونا ہوا تو انہیں اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا جب تک یہ شادی ہو نہ جائے اور اگر نہیں تو پھر بھلے آپ جتنی جلدی مرضی کر لیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔۔۔" میرے کہنے پر انکل مسکرا دیئے تھے۔ جبکہ پھپھو نے فوراً سرزنش کی تھی۔

"خدا انہیں پوتے کی خوشیاں دیکھنی نصیب

فرمائے۔۔۔ خیر اس بات کو اب گول کرو اور یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں داور۔۔۔ ان دونوں دوستوں کو ایک ساتھ رخصت نہ کر دیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔ فصیحہ سے بات کرتے ہیں اگر اس کے پاس کوئی ڈھنگ کا پروپوزل نہ ہوا تو ہم خود اپنی بنی کے لیے حماد جیسا ہی کوئی سپر ہٹ بندہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" انکل مسکرا کر کہتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔

"شانزے اس بات کو محض مذاق مت سمجھنا۔۔۔ میں واقعی سنجیدہ ہوں اور اگر اس سلسلے میں تمہارا اپنا کوئی انتخاب ہو تو تم بلا **جھجھک** مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" ان کی بات سن کر میں نے بہت اطمینان سے فریش اورنج جوس ختم کر کے کہا تھا۔

"پھپھو۔۔۔ شادی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔۔۔ یہ تو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہے۔ جس میں اسے اپنا وجود ہی نہیں۔۔۔ اپنے خواب، خواہشیں، آرزوئیں تمنائیں بلکہ زندگی تک پیار بھرے مان اور اعتبار کے ساتھ داؤ پر لگانی پڑتی ہے اور اگر اس جوئے میں شکست انسان کا مقدر بن جائے ناں تو پھر وہ زندہ نہیں رہتا صرف سانس لیتا ہے۔۔۔ جیسے بابا نے اپنی زندگی کے چوبیس سال صرف سانس لیتے ہوئے گزارے تھے اور پھپھو مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ یہ جوا کھیلنے کے لیے کسی فرد پر اعتبار کر سکوں اس لیے میرا خیال ہے کہ اس بات کو سنجیدگی کی بجائے محض مذاق ہی رہنے دیں۔"

میں بہت نارمل انداز میں کہہ کر، کرسی دھکیل کر اٹھ گئی تھی اور میرے کمرے میں داخل ہونے تک پھپھو کی پرسوچ، متفکر نظریں میرا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"شانزے۔۔۔ ڈیئر یہ تم ہی ہو ناں؟" ریسیور اٹھا کر ہیلو کہتے ہی جو بے تاب سی آشنا آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی اسے سننے کے فوراً بعد مجھے ریسیور رکھ دینے کا خیال ہی آیا تھا۔ مگر دوسری طرف میرے ارادے کو غالباً "بھانپ لیا گیا تھا۔

"پلیز شان فون بند نہ کرنا۔۔۔ پلیز ایک مرتبہ میری بات سن لو۔" مما کا لہجہ مخصوص تمکنت سے عاری تھا۔ میں ریسیور رکھتے رکھتے ایک لمحے کو ٹھہر سی گئی تھی۔

"جانو۔۔۔ تم گھر کیوں نہیں آتیں۔۔۔ مجھ سے ملتی کیوں نہیں۔۔۔ کتنے دن ہو گئے میں نے تمہیں دیکھا تک نہیں تم سے بات تک نہیں کی۔ شان مجھے اس طرح سے اذیت مت دو۔۔۔" وہ نڈھال لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"ہاں اذیت دینے کا حق تو صرف آپ کو ہی حاصل ہے۔" میں دل کی بات ہونٹوں تک نہیں لائی تھی۔

"میں کتنی بار لیلیٰ کی طرف آئی ہوں مگر تم نظر ہی نہیں آئیں۔"

"نظر تو میں آپ کو اس وقت بھی نہیں آتی تھی جب میں آپ کے چاروں طرف موجود ہوتی تھی۔"

"کہاں ہوتی ہو آج کل۔۔۔ یونیورسٹی تو تم جاتی نہیں ہو اور۔۔۔ اور تم گھر بھی نہیں آتیں۔۔۔ شانزے پلیز گھر لوٹ آؤ ناں۔" انہوں نے جیسے التجا کی تھی۔

"ہاسٹل میں تم نے جس طرح مجھ سے بی ہیو کیا تھا میں سب کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی تھی رہی سہی کسر تم اب پوری کر رہی ہو۔۔۔ ہر آنے جانے والا مجھ سے تمہارے متعلق پوچھتا ہے آخر تم کب آؤ گی۔۔۔ شانزے اگر تم کہو تو میں خود تمہیں لینے آجاتی ہوں مگر پلیز ایسے مت کرو۔"

"اوہ تو "لوگوں" کا خوف آپ کو میری طرف پلٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

"ہیلو۔۔۔ شانزے تم سن رہی ہو ناں۔۔۔ دیکھو صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔۔۔ مجھے ایک موقع تو دو۔۔۔ آخر میں تمہاری ماں ہوں شانزے۔۔۔" نجانے کیوں مجھے ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی سی محسوس ہوئی تھی۔

"اور یہ آخری بات ہی تو مجھے مار ڈالتی ہے۔۔۔ کہ

آپ میری ماں ہیں۔"
"ہیلو۔ شان تم بول کیوں نہیں رہیں میری بات تو سن رہی ہو ناں۔۔۔۔ ہیلو ہیلو۔" وہ پکارتے ہوئے بار بار کریڈل دبانے لگی تھیں اور میں نے چپکے سے ریسیور رکھ دیا تھا اور بالکل غیرارادی طور پر میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

آسمان کو اپنی آغوش میں لیتے طویل قامت درخت نہر کے پانیوں پر جیسے جھکے آ رہے تھے۔ نیم خوابیدہ سبز پانی اس وقت ٹھہرے سکوت کی زد میں تھا۔ نم آلود خنک سرسراتی ہوئی ہوا سبز پتوں کے سنگ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔

ماحول پر ایک عجیب خوابناک سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کی اوٹ سے جھانکتے سورج کی سنہری کرنیں عالم مدہوشی میں اس آبی فرش پر محو رقصاں تھیں۔ سفید پرندے ڈار کی صورت نہر کے کنارے پر اترے تھے اور اس سنہری پانی میں ڈبکی لگا کر دوسری سمت پرواز کر گئے تھے۔ میں نہر کے کنارے پر ایک درخت کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور بے خیالی میں ہی اپنے آس پاس لگی گھاس کو نوچ رہی تھی۔ تبھی عقب میں گاڑی رکنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا اور گاڑی سے اترتے شخص کو دیکھ کر میں اپنی بے تحاشا حیرت پر قابو نہ پا سکی تھی۔

"کمال ہے۔۔۔۔ یہ شخص ہر اس جگہ یا تو پہلے سے موجود ہوتا ہے یا بعد میں آن وارد ہوتا ہے جہاں میری موجودگی کے قوی امکان ہوں اور اس کے باوجود یہ جاسوسی فلموں کا ہیرو بننے سے انکاری ہے۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف آیا تھا اور میرے عین سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا تھا اپنی سیاہ چمکدار آنکھیں میرے چہرے پر ٹکا کے۔ میں منتظر ہی رہی کہ وہ کچھ کہے گا مگر وہ ہونٹ بھینچے گہری نگاہوں سے میرے چہرے کو کھوج رہا تھا اور حقیقتاً" میں اپنی تمام تر بولڈ نیس کے باوجود اس کی پرتپش نگاہوں سے گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

"کیوں تنگ کرتی ہو شانزے۔" بات کرنے کے باوجود انداز جوں کا توں تھا۔

"واٹ۔ میں تنگ کر رہی ہوں یا۔۔۔" میں نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آخر تم کیوں اس طرح سے چھپتی پھر رہی ہو جیسے مجرم کوئی اور نہیں تم ہو۔"

اس کے کہنے پر ہی میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ پائی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے پھپھو کے گھر مما کو داخل ہوتے دیکھا تو میں چپکے سے عقبی دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔ میں جانتی تھی مما اپنی ساکھ کی بحالی کے لیے میرے سامنے ملتجی انداز اختیار کریں گی اور میں ان کے سامنے کسی طور نرم نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اسی لیے ان کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ میرے اور ان کے درمیان جو خلیج حائل ہو چکی تھی اسے پاٹنا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ تو پھر ان کا سامنا کر کے دوسروں کو خود پر ہنسنے کا موقع کیوں دیتی۔

"اب کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟" وہ استفسار کر رہا تھا۔

"کیوں بولوں؟" میں نے اپنے سامنے کی گھاس نوچنی شروع کر دی تھی۔

"یہی کہ اس طرح کب تک چلے گا وہ تمہاری ماں ہیں شانزے تم ان سے اس طرح لاتعلقی اختیار نہیں کر سکتی ہو۔" اس نے مجھے کسی حقیقت سے آشنا کرانا چاہا تھا۔

"واٹ ڈو یو مین ولید احتشام۔۔۔۔ تمہارا خیال ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے ان کے سینے سے جا لگوں اور کہوں کہ ڈیئر مام آج سے میرے اور آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔" میں نے بگڑ کر کہا تھا۔

"میں نے یہ کب کہا۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"تو پھر ایف آئی آر درج کرواؤں ان کے خلاف عدالت میں گھسیٹ لوں انہیں۔۔۔۔ پھانسی کے تختے پر لے جاؤں انہیں یا پھر چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتاؤں کہ میری ماں قاتل ہے۔۔۔۔ یا پھر اپنی ہی جان پر کھیل

جاؤں۔" میں سخت غصے میں آکر پھٹ پڑی تھی۔

"پلیز کول ڈاؤن شانزے میں نے تمہیں ایسا کچھ بھی کرنے کو نہیں کہا۔" اطمینان ہنوز اس کے انداز پر غالب تھا۔

"تو پھر ان سارے حالات سے فرار حاصل نہیں کروں تو پھر کیا کروں؟" میں نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔

"تم ۔۔۔ تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔" اس نے اعتماد سے کہہ کر مجھے ہر بات بھلادی تھی اور میں نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھے گئی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں شانزے تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو میں اس کے بدلے تمہیں ہر وہ خوشی دوں گا جس پر میرا ذرا سا بھی اختیار رہا۔

دیکھو شانزے ایمان حسن یہ جو شاہراہ حیات ہے ناں اس پر انسان اپنی مرضی سے سفر کا آغاز نہیں کرتا اور نہ صرف سفر کا اختتام اس کی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ اسے تو بس ایک ان دیکھی ڈور ہے جو ان رستوں پر چلا رہی ہے اور اسے اس شاہراہ کے ہر اجنبی موڑ، اجنبی راستے پر اعتبار کرنا ہے اور کٹھن راستے پر سفر کرنے کے لیے ہر مسافر کو ایک **ہمسفر** کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی اور تم بھی یہ سفر تنہا نہیں کاٹ سکو گی ۔۔۔ تمہیں کسی نہ کسی فرد پر اعتبار کرنا ہوگا تاکہ جب تم تھک جاؤ تو وہ تمہاری تھکن سمیٹ سکے۔ اندھیرے تم پر غالب آنے لگیں ۔۔۔ تو وہ جگنو بن کر تمہارے ساتھ سفر کر سکے اس سفر کی صعوبتیں تمہارے پیروں پر آبلوں کی صورت ظاہر ہوں تو اس کا محبت بھرا لمس تمہیں اذیت سے نجات دلادے۔

اور ایسے کسی **ہمسفر** کی تلاش تمہیں باہر نہیں اپنے دل کے اندر کرنی ہوگی جو اپنے فیصلوں پر آپ مختار ہے۔ جو ان دیکھے، ان جانے جذبوں کو محسوس کرنے پر قادر ہے۔

مجھے نہیں معلوم شانزے ۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا عشق مگر میرے دل میں تمہارے لیے جو جذبہ ہے وہ مجھے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنے نہیں دیتا۔ میں اپنے اس جذبے کو ایک ہزار ایک تشبیہات دے سکتا ہوں مگر دوں گا نہیں۔ میں محبت بھرے ڈائیلاگز بھی بول سکتا ہوں مگر اس وقت کچھ کہوں گا نہیں کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں تمہیں اپنے حق میں کنوینس کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں تمہیں صرف ایک آپشن دے کر جا رہا ہوں اپنی صورت میں۔

تم میرے بجائے کسی اور کو یہ اعتبار بخشوگی تو بھی مجھے اس بات کی خوشی ضرور ہوگی کہ راہ حیات میں تم تنہا نہیں ہوگی۔"

دھیرے دھیرے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے میری کھلی ساکت آنکھوں میں جھانکا تھا اور پھر کوئی رسپانس نہ پاکر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں منتظر رہوں گا شانزے ۔۔۔ کیونکہ دسمبر کے آخری ہفتے میں پیرس جا رہا ہوں اور اگر تم اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ کرپاؤ تو بھی کوئی مسئلہ نہیں ۔۔۔ کیونکہ راہ حیات پر میں تمہارا انتظار بہت دور تک کر سکتا ہوں۔"

وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے پلٹ گیا تھا اس کے قدموں کی دھمک سے کتنے ہی چھوٹے بڑے کنکر نہر کے ساکت پانیوں میں گر کر ارتعاش پیدا کر گئے تھے۔ سبز کاہی پانی میں کتنے ہی دائرے بنتے چلے گئے تھے اور میں اپنی جگہ ساکت بیٹھی ان دائروں کو دیکھ رہی تھی۔ ولید احتشام ایسا ہی ارتعاش میرے دل میں پھیلا گیا تھا اور اب ایسے ہی دائرے میرے وجود میں وسعت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"کون غلط ہے کون درست ۔۔۔ اس کا فیصلہ تمہارا دل کرے گا آج یا کل کا انتظار کیے بغیر۔"

"**ہمسفر** کی تلاش تمہیں باہر نہیں اپنے دل کے اندر کرنی ہوگی ۔۔۔ جو اپنے فیصلوں پر آپ مختار ہے ۔۔۔ جو ان دیکھے، ان جانے جذبوں کو محسوس کرنے پر قادر ہے۔"

کتنا درست کہا تھا اس نے یہ وہی دل تھا جو ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اب کسی پر اعتبار نہیں کرے گا اور اب

جو فیصلہ کیا تھا تو ایک پل بھی نہیں لگا تھا۔
یا شاید فیصلے کی بھی کوئی گھڑی کاتب تقدیر نے لکھ چھوڑی ہے اور پنڈولم کی طرح "ہاں" یا "ناں" کے درمیان ڈولتا ہوا انسان اس گھڑی پر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو جاتا ہے اور یہ دل اپنا فیصلہ سنا کر تقدیر کے لکھے پر تصدیق کی مہر ثبت کر دیتا ہے اور اپنے دل کی آواز سن کر میں نے بھی یہ ہی سوچا تھا۔
"شاید اسے بھی عادت ہو گئی ہے دھوکا کھانے کی اور دھوکا کھانے سے پہلے اعتبار کرنا لازم ہے سو یہ دل اعتبار کر رہا ہے۔"
رات کے دوسرے پہر دل نے یہ مژدہ سنایا تھا اور میں نے اسی لمحے ریسیور اٹھا کر ولید احتشام کے نمبر ڈائل کر دیئے تھے دوسری جانب ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔
"ہیلو۔" نیند میں ڈوبی خمار آلود آواز سنائی دی تھی اور اس آواز کے پیچھے رات کا محسوس کیا جانے والا سناٹا تھا۔
"ہیلو۔۔۔ ہو از دس۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد استفسار کیا گیا تھا۔
"سنو ولید احتشام۔۔۔۔ پیرس جانے کے لیے ایک کی بجائے دو ٹکٹ لے لینا۔۔۔۔ نیکسٹ ویک میں بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔"
میں نے آہستگی سے کہا تھا۔ دوسری جانب ایک لمحے کی خاموشی چھا گئی تھی جس سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے ریسیور رکھ دیا تھا۔
اور پھر چند روز بعد میرون اور فان کلر کے لہنگے میں قد آدم آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے میں نے دیزہ کو بتایا تھا کہ اب سے کچھ دیر پہلے میں شانزے ایمان سے شانزے ولید ہو گئی ہوں تو کچھ دیر سکتے میں رہنے کے بعد وہ اس زور سے چیخی تھی کہ مجھے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اور پھر بے حد ناراض ہوتے ہوئے اس نے روہانسے لہجے میں کہا تھا۔
"تم میرا انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔۔۔ آخر میں یہاں مرنے تو نہیں آئی تھی۔۔۔ واپس آ ہی جاتی کچھ

عرصے بعد۔"

"نہیں ونیزہ۔۔ اب حالات سے فرار ہونا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا اور پھر ولید تقریباً" دو سال کے کنٹریکٹ پر پیرس جا رہے ہیں اور مجھے لگا تھا کہ اگر یہ وقت میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر تمام عمر میں کسی پر اعتبار نہ کر پاؤں گی۔"

اور ونیزہ کو سمجھانے کے لیے لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت تو نہ تھی اسی لیے کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی تھی۔

"اچھا۔۔ یہ بتاؤ کوئی ڈھنگ کا سوٹ بھی بنوا لیا تھا یا جینز اور جیکٹ میں ہی نکاح پڑھ لیا تھا۔"

تب میں آئینے میں دیکھ کر اسے اپنے متعلق تفصیل سے بتانے لگی تھی اور مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ ایک دم چونکی تھی۔

"ارے ہاں شانزے میں نے سنا تھا کہ وہ جمشید آفندی۔۔" کلک کی آواز کے ساتھ ہی رابطہ کٹ گیا تھا اور میں نے حیرت سے اپنے کریڈل پہ رکھے ہاتھ کو دیکھا تھا۔

"کیسا بے نام رشتہ ہے میرا تمہارے ساتھ جمشید آفندی کہ حقیقت ہونے کے باوجود میں تمہارے بارے میں کچھ غلط نہیں سن سکتی۔"

کچھ سوچتے ہوئے میں نے عاصم کا پرسنل نمبر پریس کیا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی نسوانی آواز ابھری تھی جسے سن کر میں چونک گئی تھی اور پھر اس آواز کو پہچان کر میں اچھل ہی تو پڑی تھی۔

"شہزینہ۔"

"ارے۔۔ شانزے۔۔ ہاں بھئی یہ میں ہی ہوں لیکن اب مسز عاصم ہوں۔" اس کا لہجہ کچھ پا لینے کی وشی سے سرشار تھا۔ شہزینہ کو ڈھیر ساری مبارکباد ینے کے بعد میں نے عاصم سے بات کی تو گفتگو کے تام پر میں نے اس سے کہا تھا۔

"سنو کبھی اس شخص کا سامنا ہو تو میری جانب سے ے کہنا۔۔ سبز آنکھوں کی جوت مدھم نہ ہونے پائے ک عرصے بعد ہم سب دوبارہ ایک جگہ اکٹھے ہوں ے۔" دارالاطفال میں ایک بار پھر بہار اترے گی

اسے کہنا ہم سب اس کی واپسی کے منتظر ہیں۔" میری آواز میں نمی گھلنے لگی تھی اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
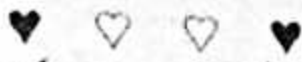
"دیکھ لو شانزے گڑیا میں نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ حماد حسن سے زیادہ جینٹس 'ڈیشنگ اور سپیریئر بندہ ڈھونڈا ہے تمہارے لیے۔"

جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر داور انکل نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار گرے سوٹ میں ملبوس ولید کو دیکھنے لگی تھی جو حماد سے محو گفتگو تھا۔

"ونیزہ واپس آئے گی تو جلد ہی اس کی بھی شادی ہو جائے گی، ہم لوگ تو بالکل اکیلے رہ جائیں گے شانزے۔" پھپھو بار بار آنسو بہا رہی تھیں۔

"پھپھو۔۔۔ ونیزہ تو اپنے ہی شہر میں رہے گی، آپ کو تنہائی کا زیادہ احساس نہیں ہو گا۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دی۔

"ہاں مگر تمہیں دیکھ کر ایمان حسن سے دوری کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ دل کو ڈھارس مل جاتی تھی کہ بھائی کی نشانی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

"کم آن لیلیٰ کیوں بچی کو اداس کر رہی ہو، بھئی دو سال کی تو بات ہے چٹکی بجاتے ہی گزر جائیں گے۔" داور انکل نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

"بھئی اب ذرا جلدی کریں میرا خیال ہے اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے۔" حماد بھائی نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"اوکے شانزے بیٹا۔۔ وش یو آل دا بیسٹ۔" احتشام انکل نے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیشانی کو پیار کیا تو ان کے وجود سے ویسی ہی خوشبو مجھے محصور کرنے لگی تھی جیسی بابا کے وجود سے پھوٹتی تھی۔

"اور اگر آج بابا یہاں ہوتے تو۔۔۔۔" میں نے تصور ہی تصور میں خود کو بابا سے ملتے ہوئے دیکھا تھا اور چپکے سے اپنی پلکوں پہ اٹکے آنسوؤں کو پونچھ لیا تھا۔

"ہری اپ شانزے۔" ولید احتشام کی آواز اس لمحے مجھے سہارا محسوس ہوئی تھی۔ احتشام انکل سے جدا ہوتے ہوئے میری نظریں یونہی بھٹک کر کچھ دور جا

ٹھہری تھیں۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں سے مسلسل کچلتی ہوئی وہ بہت بے بس لگ رہی تھیں۔ لرزتی کانپتی انگلیاں ایک دوسرے میں سختی سے پیوست تھیں پلکیں جھپک جھپک کر وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے باوجود ان کے چہرے کی زردی اور پژمردگی میری نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی تھی۔

میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی شاید ان میں ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا سکتیں۔ یا شاید انہیں ڈر تھا کہ ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر انہیں دھتکار دوں گی۔

"بھئی **فصیحہ** کیوں دل چھوٹا کر رہی ہو' بیلیو می یہ ولید احتشام اپنے باپ سے بھی زیادہ لونگ اور کیئرنگ ہے یہ ہماری بیٹی کو ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھے گا۔"

احتشام انکل نے انہیں دونوں کاندھوں سے تھام کر شگفتگی سے کہا تھا۔ اور شاید ان کا سہارا پا کر ہی انہوں نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ایک دم چھلک گئی تھیں۔ اور ان کا چہرہ بھیگتا چلا گیا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے بہتے آنسوؤں میں وہ سب کچھ موجود تھا جسے میں ہمیشہ ان کے چہرے پر کھوجتی رہی تھی۔

دکھ کا احساس

پچھتاوے کے آنسو

احساس جرم

احساس زیاں

احساس ندامت

احساس محرومی

وہ تو جیسے تہی داماں کھڑی تھیں۔ اور اس لمحے مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ میرے سامنے نہیں کھڑیں بلکہ وہ تو اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی ہیں۔

"اور میں آپ کو کسی عدالت میں کیسے پیش کرتی مما کہ میرے پاس کوئی گواہ تھا نہ کوئی ثبوت' نہ کوئی عینی شاہد آپ کو تو خود ہی چل کر اپنے ضمیر کے کٹہرے میں پیش ہونا تھا۔ جہاں آپ ہی وکیل ہیں آپ ہی مجرم عینی شاہد بھی آپ خود ہیں اور جرم کا سب سے بڑا ثبوت بھی۔ اور یہ عدالت آپ کو جو سزا سنائے گی وہ دنیا کی کسی بھی عدالت سے بڑھ کر سخت اور کڑی ہوگی۔ جس کا نہ کوئی وقت ہوگا نہ معیار۔ آپ کو خود ہی اس آگ میں جل کر راکھ ہونا ہوگا۔ اور کوئی ہاتھ آپ کو بچانے کے لیے آپ کی طرف نہیں بڑھے گا۔

"چلو شانزے' دیر ہو رہی ہے۔" ولید نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے چونکایا تھا۔

"خدا حافظ مما۔" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا ان کے لب ایک لمحے کے لیے تھرتھرائے تھے اور نظریں جھک گئی تھیں۔ میں ولید کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اور ذرا دور جا کر جب میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا تھا تو ولید نے مجھے ٹوک دیا تھا۔

"شانزے جاتے ہوئے ماہ و سال کی طرح خار زار راستے بھی اختتام پذیر ہو چکے ہیں اب مڑ کر دیکھنے کی بجائے سامنے دیکھو سال نو کے اولین سورج کی کرنوں کو دیکھو' وہاں دیکھو جہاں پھول ہیں رنگ ہیں اور خوشیاں میرے اور تمہارے استقبال میں ڈیرے ڈالے بیٹھی ہیں جہاں بہاریں رقص میں ہیں اور جہاں مسکراہٹیں میری اور تمہاری منتظر ہیں۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے میری اداسی کو دور کرنا چاہا تو میں بے اختیار مسکرا دی تھی۔

"اور یہ شخص..... جس کی محبت کے خالص پن کا سب سے بڑا گواہ میرا دل ہے اور جس کی محبت کی مہک ایسی ہی مسحور کن ہے جیسے کچی مٹی پر بارش کی پہلی پھوار پڑے تو اس کی سوندھی مہک انسان کو مدہوش کر ڈالے۔ اور اگر میں نے اس شخص پر اعتبار کیا ہے تو یہ فیصلہ کچھ غلط تو نہیں۔"

میں نے ایمانداری سے اعتراف کیا اور اس شخص کے سنگ ہولی تھی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میری ساری تھکن سمیٹ لے گا۔

اور جب اندھیرے مجھ پر غالب آنے لگیں گے تو وہ جگنو بن کر میرے ساتھ سفر کرے گا۔

★